احتشام حسین

ایک مطالعہ

ڈاکٹر اخلاق اثر

مصنف کی دوسری کتابیں

کتاب کا نام	احتشام حسین (ایک مطالعہ)
ناشر	طارق پبلی کیشنز، صادق منزل، چوک امام باڑہ، بھوپال
تقسیم کار	باسط خان، بھوپال بکڈپو، بدھوارہ، بھوپال
سالِ اشاعت	۱۹۸۸ء ایف ڈی ۲۰۰
کتابت	طاہرہ بانو، ناگپور
مطبع	نوری پریس، مومنپورہ ناگپور ۱۸
جزوی مالی اشتراک	مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال
قیمت	پچیس روپے

ڈاکٹر فدا المصطفیٰ فدوی، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
ڈاکٹر رشید آشار، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر
محمد خضر حیات، ڈاکٹر محمد اسمٰعیل ساجد
ڈاکٹر شیخ رحمٰن آکولوی، شکیل اعجاز
مرزا رفیق شاکر کھامگانوی، ڈاکٹر محمد ناصر
محمد ظہیر طاہر، ڈاکٹر ریحانہ جاوید،
محمد اظہر حیات، شیخ چاند، محمد عطاءاللہ
برکت اللہ انصاری اور منصور اعجاز کی علمی و
ادبی کاوشوں کے نام۔

ترتیب

مکاتیبِ احتشام

پروفیسر سید احتشام حسین اردو زبان کے قابلِ فخر محقق، نقاد، ماہرِ لسانیات اور ادیب تھے۔ شعر اور ڈراما میں بھی ان کی خدمات کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں۔ ان کی بیوقت موت سے ہماری زبان اور ادب کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ احتشام حسین کی شخصیت اور ادبی خدمات کا جائزہ لینے اور ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مختلف رسائل نے خاص نمبر شائع کیے۔ مختلف یونیورسٹیوں میں ان کی ادبی خدمات پر تحقیقی مقالے شائع کیے جارہے ہیں گویا جیتے جی اور موت کے بعد بھی احتشام حسین اردو ادب کی اہم آواز ہیں۔

احتشام حسین کے دوست احباب، عزیز واقارب، شاگردوں اور نیازمندوں کا بڑا حلقہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر پھیلا ہوا ہے۔ ان سے احتشام حسین کی خط وکتابت تھی۔ ان میں سے کچھ مکاتیب اور مکاتیب کے اقتباسات شائع ہو چکے ہیں۔ احتشام حسین کی شخصیت ان کے افکار وخیالات، ان کے ہمعصروں اور ان کے عہد کے مطالعہ کیلئے احتشام حسین کے مکاتیب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی لیے یہ مکاتیب شائع کیے جارہے ہیں۔ ان کے مکتوب الیہ وہ اصحاب ہیں جو اس زمانے میں مدھیہ پردیش میں مقیم تھے۔

مشاہیر کے مکاتیب ادب کا دلچسپ، اہم اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ تحقیق اور تنقید کے بہت سے تاریک گوشے مکاتیب کے ذریعے ہی سے روشن ہوتے ہیں عام طور سے شخصیت کے مطالعے

اور اسلوبِ بیان کے تعلق ہی سے اہمیت دی جاتی ہے، اور ان کی تنقیدی اور تحقیقی حیثیت نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ ایک خط کسی فنکار کی نجی زندگی کے اظہار اور ادبی اسلوبِ بیان کے بغیر بھی اہم ہوتا ہے۔ کسی خاص وقت میں اس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حال اور مستقبل کے کسی موڑ پر کوئی معمولی خط وہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے جو تسلیم شدہ اور مشہور خط کو حاصل نہیں ہوتی۔

احتشام حسین کے ان مکاتیب میں ان کی شخصیت کے تمام نقوش واضح ہو گئے ہیں۔ یہاں ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی جیتی جاگتی تصویریں محفوظ ہیں۔ احتشام حسین ان کے استاد انکے شاگرد، انکے دوست احباب، ان کے ہمعصر، ان کے عزیز و اقربا، لکھنؤ اور الہ آباد کی یونیورسٹیاں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تنقید و تحقیق کا کام، ان کے عہد اور ان اور ان کے عہد کی روح کی تمام گہرائیاں ان مکاتیب میں سمٹ آئی ہیں۔ معروف احتشام حسین، تنہا احتشام حسین، پروفیسر احتشام حسین اور جذباتی احتشام حسین سب سے آپ کی ملاقات ہو جائیگی احتشام حسین کے اسلوب بیان کا تعارف بھی ہو جائیگا۔

ان میں سب سے زیادہ یعنی پینتیس مکاتیب ڈاکٹر گیان چند کے نام ہیں۔ تیس ان کے بھوپال کے قیام کے دوران اور پانچ جموں میں قیام کے دوران لکھے گئے تھے۔ پہلا خط ۵ فروری ۱۹۵۸ء اور آخری خط ۷ جولائی ۱۹۷۱ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ ان مکاتیب میں بیسیوں متنوع موضوعات کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور ان کے متعدد احباب کا بھی ذکر ہے۔

ایک خط میں احتشام حسین کا احساسِ کرب ملاحظہ فرمایئے۔

خط ملا۔ مومن کی شاعری مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں۔ لیکن ان کا ایک شعر کبھی کبھی ان دوستوں کو خط میں لکھتا ہوں، جنہیں یہ شک ہو جاتا ہے کہ شاید ان کی کوئی بات مجھے پسند نہیں آئی، شعر یہ ہے:

نارسائی سے دم رکے، تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

یقین کیجیے کہ مجھے ذرہ برابر بھی کوئی خیال نہیں ہے۔ زور صاحب سے البتہ ذرا سی شکایت ہے وہ بھی ناراضی نہیں، کہ انھوں نے مجھ پر خورشید الاسلام کو ترجیح دی۔ اگر یہ فیصلہ واقعی ان کے ضمیر کا ہوتا، تو کوئی بات نہ تھی۔ صرف اس لیے کہ کچھ لوگ وہاں میری مخالفت کر رہے تھے۔ انھیں خوش کرنا تھا۔ خیر مجھے اس کا خیال نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے متعلق کبھی کوئی ایسی بات نہیں سوچینگے، جو میرے لیے نقصان پر مبنی ہو۔ بس یہ بڑی بات ہے۔

احتشام حسین آخر ایک انسان تھے اور ہر انسان کی اپنی ذمہ داری اور مجبوری ہوتی ہے۔ ذاتی اور نجی غرض کا اظہار اس خط میں دیکھیے:

اب میں اپنی ایک بالکل نجی اور ذاتی غرض کا اظہار کرتا ہوں۔ میرے لڑکے جعفر عباس نے دہلی یونیورسٹی سے ایم، اے اردو فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پوزیشن بھی فرسٹ ہے اس میں جو خامیاں ہیں، وہ بھی جانتا ہوں لیکن پھر بھی ایمان داری سے یہ سمجھتا ہوں کہ جس قسم کے لوگ کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں لکچرر ہو جاتے ہیں۔ ان سے زیادہ کمتر نہیں ہے۔ آپ کی جو محبت اور شفقت مجھ پر ہے اس کی وجہ سے یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اس کے مستقبل کے بارے میں آپ کو بھی میری ہی طرح فکر ہوگی۔ اب جیسے جیسے سبکدوش ہونے کا وقت آتا جا رہا ہے خاندان کا بوجھ زیادہ محسوس ہو رہا ہے۔ میں بہت بے عمل انسان ہوں اور دنیاوی معاملات میں حماقت کی حد تک کورا۔ اپنا نجی معاملہ ہو تو اور زیادہ گونگا ہو جاتا ہوں۔ صرف چند دوست اور ہمدرد ہیں، جن سے کچھ کہہ سکتا ہوں۔ ان میں آپ بھی ہیں اب ضرورت ہے کہ اسے بھی نگاہ میں رکھیے۔ اور جہاں کہیں بھی آپ کا اثر ہو، زور ہو، اس کے لیے کچھ کیجیے۔ دہلی میں جامعہ ملیہ میں جگہ ہوئی ہے وہ بھی درخواست گزار ہے۔ ممکن ہے، دہلی میں اور جگہیں ہوں۔ خبر ہے کہ پٹیالہ میں کوئی جگہ ہوئی ہے غرض کہ جہاں کہیں

بھی آپ کچھ کرسکیں، مجھ پر احسان ہوگا۔

اسی قسم کا ایک خط احتشام حسین نے ڈاکٹر گوپی چند کو بھی تحریر فرمایا:

یہ خط بغیر کسی تمہید کے اپنی ایک غرض کے سلسلے میں لکھ رہا ہوں۔ شاید آپ کو خیال ہو میرے لڑکے جعفر عباس نے دلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم، اے کیا تھا۔ اس کے متعلق مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ وہ اگر یونیورسٹی میں نہ ہوا تو بہت سے لوگ اس کے فیض سے محروم رہ جائینگے۔ لیکن جانتا ہوں کہ وہ بہت سے طالب علموں سے بہتر ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے اچھا رہا۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ کے الونگ انسٹی ٹیوٹ میں ایک جگہ ہوئی ہے، مشورہ دیجئے کہ اس سلسلے میں جعفر عباس کے لئے کیا ہوسکتا ہے۔ میں نے اس وقت تک اپنے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہا ہے۔ لیکن یہ ظلم دوسروں پر کیوں کروں۔ سرور صاحب کو بھی لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ خطرہ یہ ہے کہ اگر وہ کچھ دن اور بیکار رہا تو بہک جائیگا بہرحال آپ کے جواب کا انتظار کر کے کچھ اور کرونگا۔

ان خطوط کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ انھوں نے جعفر عباس کی ملازمت کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا۔

احتشام حسین کی اپنی زندگی کی جھلک دیکھیے۔ ڈاکٹر گیان چند کے والد کے انتقال کے موقع پر لکھتے ہیں۔

چند دن ہوئے سرور صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ اس نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم ہوگئے۔ جسے شفقتِ پدری کہا جاتا ہے۔ بھائی اصبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں نے تو یہ دولت اس وقت کھوئی، جب نویں درجہ کا طالب علم تھا، اور زندگی کے جھمیلوں سے بالکل واقف نہ تھا۔ نہ پیروں میں کھڑے ہونے کی سکت تھی۔ اور نہ ذہن میں سوچنے کی صلاحیت۔ آپ عمر کا ایک حصہ گزار

لائے ہیں۔ اس لیے یہ تو فطری ہے کہ باپ کے مرنے کا غم ہو اور اسی پیمانہ سے زیادہ یا کم ہو۔ جتنا آپ ان کے قریب رہ کر محسوس کرتے تھے۔ لیکن یہ سوچ کر صبر کرنا چاہیے کہ اس گھڑی کا کسی نہ کسی وقت آنا لازمی تھا اس وقت آ گئی ؟ اپنا بس کیا تھا!

احتشام حسین کی تہذیب و شرافت ملاحظہ فرمائیے۔ ڈاکٹر گیان چند کے ۱۹۶۲ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی مجلسِ عاملہ کے آخری لائف ممبر منتخب ہونے پر تحریر فرماتے ہیں!

خیال تھا کہ اس سے پہلے آپ کو خط لکھونگا۔ لیکن اس لئے رک گیا کہ اس میں احسان جتانے کا شائبہ نہ پیدا ہو جائے یہ کوئی بڑا اعزاز نہیں ہے۔ لیکن آپ جو خدمت اردو کی کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے آپ کی رائے اور مشورہ کو اہمیت حاصل رہیگی۔ میں نے خیال کیا کہ اس طرح کے کاموں میں بھی شریک ہونا چاہیے۔ محض خاموشی سے پڑھتے لکھتے رہنا کافی نہیں ہوتا آپ دیکھیں گے کہ وہاں کام کچھ زیادہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی صحیح اور معقول مشورے مفید ہوتے ہیں۔

احتشام حسین، ڈاکٹر گیان چند کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی ادبی خدمات کا ذکر اپنے مضامین، تقریروں اور نشریوں میں کیا کرتے تھے۔ احتشام حسین کے انتقال سے ڈاکٹر گیان چند کو بہت صدمہ ہوا۔ جسکا اندازہ ان کے مضامین "احتشام صاحب" (ترنم، لکھنؤ جنوری ۱۹۷۳ء) "احتشام حسین، کچھ منتشر یادیں" (نیا دور، مئی رجون ۱۹۷۳ء) "احتشام حسین: کچھ بھولی بسری یادیں" (فروغ اردو، فروری ۱۹۷۴ء) کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

بنام ڈاکٹر ابو محمد سحر

ڈاکٹر ابو محمد سحر کے نام احتشام حسین کے چار مکتوب ہیں جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۷ء اور ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء کے درمیان لکھے گئے تھے۔ ان مکاتیب میں بھی حسب معمول بعض کتابوں، تعلیمی مسائل اور کچھ احباب کا تذکرہ ملتا ہے۔ بلکہ ان میں انکی شخصیت کے بعض شگفتہ پہلو بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کی نگرانی میں نعیمہ سلطانہ "میر کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ" پر پی ایچ ڈی کی سند کے لئے تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے احتشام حسین سے اس موضوع کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا:

اس موضوع کا خاکہ اس طرح بنایا جائے کہ سماجی، سوانحی، صوفیانہ اور فکری پہلو پر بحث ہو جائے۔ اس کے علاوہ قصوں کا پلاٹ، کردار، مثنوی کے فنی لوازم وغیرہ پر الگ الگ ابواب ہو جائیں تو کام محنت کا ہو سکتا ہے، خاصا مواد ڈاکٹر طاجین (ڈاکٹر گیان چند) کے مقالے میں مل جائیگا۔ اس سے خاکہ بنانے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ یہ بحث بھی ہو سکتی ہے کہ میر کی غزلیہ شاعری کا کتنا گہرا اثر ان کی مثنویوں پر نظر آتا ہے۔ شکار نامہ قسم کی مثنویوں کے ضمن میں کچھ تاریخی اور سماجی بحثیں بھی چھیڑی جا سکتی ہیں۔

جوش کی نظم "نیا میلاد" میں پچھتر سال کے ذکر کے بارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے احتشام حسین کو متوجہ کیا تھا۔ جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا:

جوش کی جس نظم کے متعلق آپ نے دریافت فرمایا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جوش نے کہا تھا کہ غدر اور قومی تحریکِ آزادی کے آغاز سے متعلق ہے۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ گذشتہ سو سال میں عامی شعور میں جو ارتقا ہوا ہے، وہ بھی ان کے پیش نگاہ ہے۔ اگرچہ مبہم طور پر پچھتر بس ایک اشارہ ہے۔ واقعی پچھتر سال مراد نہیں۔ میں نے ضرور کہیں اس کا سن نوٹ کیا ہے۔ لیکن ملتا نہیں، یادداشت کے بھروسے پر کہہ رہا ہوں کہ ۴۲ء اور ۴۵ء کے درمیان ہی کی ہے۔ اگر تاریخ مل گئی تو مطلع کر دونگا۔

احتشام حسین ڈاکٹر ابو محمد سحر کی شخصیت سے متاثر ہوئے تھے۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

اس دفعہ آپ کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ خیالات اور سنجیدہ ادبی شخصیت سے متاثر ہوا۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کے ادبی کارناموں کو بھی احتشام صاحب پسند فرماتے تھے۔ عزیز اندوری کو معیاری مقالوں کے مطالعے کے لیے جن مقالوں کا نام لکھا تھا۔ ان میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا گرانمایہ تحقیقی مقالہ "مطالعہ امیر" بھی شامل تھا۔

احتشام حسین کی شخصیت کے شگفتہ پہلو بھی ایک خط سے نمایاں ہوتے ہیں۔ غالب کے نو دریافت دیوان کو نام دینے کا سلسلہ نکل پڑا، تو مزاحاً تحریر فرمایا۔

ادھر نسخۂ بھوپال بخطِ امروہہ کی بحث میں آپ کا نام آتا رہا۔ دیوان چھپ گیا۔ پچھتّر روپے قیمت ہے۔ میں نے دہلی میں اس کی ڈمی دیکھی، اچھا چھپا ہے۔ دونوں جگہوں کو جوڑ کر اگر اس کا نام "امر پال" رکھ دیا جائے تو کیا بُرا ہوگا!

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے "غالبیات کے چند مباحث" میں "امر پال" سے متعلق احتشام حسین کے دلچسپ جملہ کا ذکر کیا ہے (ص ۱۵۵) شمس الرحمان فاروقی نے اس ہنسی مذاق کی تحریر کو سنجیدگی پر محمول کیا اور کمال احمد صدیقی کی "بیاضِ غالب" کا تحقیقی جائزہ" کے تبصرے میں غالب کیلئے دیوان کو احتشام حسین کے حوالے سے جگہ جگہ "امر پال" لکھا ہے۔

احتشام حسین کے چار مکاتیب پروفیسر آفاق احمد کے نام ہیں، جو ۱۳ اگست ۱۹۵۶ء

۱۹۷۱ء کے درمیان لکھے گئے تھے۔ ان میں ادبی جلسوں سے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ حلقۂ اربابِ ادب کے سالانہ اجلاس پر پیغام بھیجتے وقت اردو تحریک کے سلسلہ میں پروفیسر آفاق احمد کو لکھا:

امید ہے کہ آپ کی جدوجہد جاری ہوگی اور منافرت، افتراق اور تنگ نظری کے پہلو سے بچ کر کام کریگی۔

باسط بھوپالی کے بارے میں تحریر فرمایا:

باسط صاحب مرحوم کا دیوان (کاروانِ غزل) آپ لوگوں نے شائع کرا دیا بہت اچھا کیا۔ بہت اچھا، صاف ستھرا چھپا ہے۔ میں ان کی غزلیں پسند کرتا تھا۔ ضرور کسی نہ کسی سلسلہ میں اظہارِ خیال کرونگا۔

پروفیسر آفاق احمد کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند کو لکھتے ہیں! آفاق صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ بہت ہونہار ہیں۔ سال نو عید اور پروموشن کی مبارکباد کے بعد پی ایچ ڈی کیلئے لکھا: مجھے ابھی ایک خوشی کا اور انتظار ہے وہ یہ کہ آپ اپنا مقالہ کب تک پیش کر رہے ہیں۔ وہ پروفیسر آفاق احمد کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ان کے ترجمہ "ایک کرن اجالے کی" اور مقالہ "ٹیگور اور اردو نثر" پر اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ "ایک کرن اجالے کی" کے بارے میں لکھتے ہیں

آپ کا راج گوپال اچاری کے افسانوں کا ترجمہ بہت رواں، شستہ اور صحیح ہے۔ مجھے بیحد پسند آیا۔ ایک آدھ جگہ طرزِ اظہار یا انتخابِ الفاظ میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا تو ہر حال میں ہوتا ہے ایک بات کی طرف خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں پنجابی ادیبوں کی طرف لسانی غلطیاں پکڑنا برا سمجھتا ہوں، لیکن جہاں تک ممکن ہو۔ اس سے بچنا چاہیے۔ دو ایک جگہ آپ نے اس طرح کی عبارت لکھدی ہے جیسے "وعدہ کیا ہوا ہے"۔ ایسی معمولی باتوں کے علاوہ اس کی زبان نہایت معقول اور خوبصورت ہے۔

"ٹیگور اور اردو نثر" کے بارے میں تحریر فرمایا:

ٹیگور والے مضمون کو تھوڑا بڑھایئے: ادبِ لطیف والوں کے یہاں سے بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ ٹیگور سے تقابلی مطالعہ کر کے اس اثر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اندازِ بیان کے اس خاص پہلو

کے علاوہ جو رومانیت، ابہام، لذتیت اور اختصار میں ظاہر ہوا، اردو نثر پر براہ راست ٹیگور کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ میرزا ناصر علی، دلگیر اکبر آبادی مہدی افادی اور نیاز فتح پوری کی نثر میں اس کی جھلکیاں اس سے پہلے سے ملنے لگی تھیں۔

پروفیسر آفاق احمد کو احتشام حسین سے بڑی عقیدت ہے، جو ان کے مضامین "روشنی گھٹ گئی" (شاہکار، دسمبر ۱۹۷۳ء) اور "احتشام صاحب" (مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج میگزین) سے عیاں ہے۔

احتشام حسین کے پانچ مکاتیب جناب شمیم احمد کے نام ہیں، جو ۱۲ اپریل ۱۹۶۷ء اور ۲۱ مئی ۱۹۷۱ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ شمیم احمد "غبار خاطر" اورنگ آباد کے مدیر ہونے سے قبل ماہنامہ "مزاج" کے لیے مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ جواب میں احتشام حسین نے لکھا:

> مزاج کے سلسلے میں اور دوستوں کے خط بھی آئے تھے۔ کچھ نہ لکھ سکا اب ذرا فرصت ہوتی نظر آتی ہے۔ آخر سب کیلئے لکھتا ہوں؟ چاہے پسند کیا جائے یا نہ کیا جائے، "مزاج" کے لئے بھی لکھوں گا۔

"مزاج" کے بارے ہی میں احتشام حسین کا ایک خط شائع ہوا تھا۔ لکھا تھا:

> مزاج کے تین شمارے دیکھے ہی نہیں، تقریباً لفظ بہ لفظ پڑھے۔ جو سمجھ میں آیا، اس سے جی خوش ہوا، جو سمجھ میں نہیں آیا، اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجموعی طور پر رسالہ بہت شان سے نکل رہا ہے، اگرچہ اس کا تبلیغی انداز کھٹکتا ہے، ظاہری شکل و صورت میں جو کشش ہے، وہ قابلِ داد ہے۔ خطوں کا حصہ سب سے دلچسپ ہے۔ اس میں بہت سی آوازیں سننے کو مل جاتی ہیں، جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ ہر لکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اس نے

نئی شاعری کے سلسلے میں آخری بات کہدی، حالانکہ بعض اوقات محض بھی ہوتی ہے۔

احتشام حسین کے نزدیک "یقیناً کالج کے مقابلے میں یونیورسٹی میں زیادہ کشش ہے۔"

احتشام حسین، شمیم احمد کی تحریروں کو پسند کرتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ چنانچہ شمیم احمد کے غیر مطبوعہ مقالہ " اردو میں رپورتاژ" کے بارے میں میسور کے انٹرویو میں شمیم احمد سے فرمایا" میں نے آپکا مقالہ پڑھاہے۔ بڑی محنت کی ہے آپ نے"۔ ان کے " بھوپال میں غزل" کے مقدمہ کے بارے میں تحریر کیا: " آپکا مقدمہ دلچسپ، لیکن قدرے طویل ہے۔"

احتشام حسین کے آٹھ مکاتیب واحد پریمی کے نام ، جو ۱۱ نومبر ۱۹۶۶ء اور ۲۳ مارچ ۱۹۶۸ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ واحد پریمی کا مجموعہ کلام " گلِ نو" شائع ہونے والا تھا۔ اور وہ اسے احتشام حسین کی رائے یا دیباچے کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ ان خطوط میں دیباچے اور رائے کے بارے میں احتشام حسین نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ احتشام حسین نے واحد پریمی کو مشورہ دیا تھا۔ کہ وزیر آغا سے مقدمہ لکھوائیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ :

> میری رائے یہ ہے کہ آپ دیباچہ کی وجہ سے دیر نہ کیجیے۔ دنیا میں کوئی شخص دیباچہ یا مقدمہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ کتاب چھپ جائے تو میں قطعاً اس پر تبصرہ کردوں گا۔

وزیر آغا اور رائے سے متعلق تحریر فرمایا :

> آپ وزیر آغا صاحب سے مقدمہ لکھوایئے۔ میں بھی قطعاً چند سطریں لکھ دوں گا۔ اگر وزیر آغا صاحب لکھ دیں، تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ بہت سی رائیں یاد رکھیے، فضول ہوتی ہیں۔

واحد پریمی کی شدید خواہش اصرار پر انھوں نے اپنی رائے روانہ فرمادی۔ خط میں لکھا: چند سطریں حاضر ہیں۔ آپ واقعی دھن کے پکے ہیں۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا۔

ان کی رائے واحد پریمی کے مجموعے "دگلِ نو" کے ساتھ چھپی ہے۔ یہاں احتشام حسین کے مکاتیب کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ احتشام حسین آسانی سے کسی کے کلام پر رائے نہیں دیتے تھے، اور اسی لیے ان کی آراء کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ احتشام حسین کا ایک مکتوب مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۷۱ء حنیف کیفی کے نام ہے حنیف کیفی نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لیے مواد کی فراہمی کے دوران سانٹ جمع کیے تھے۔ اور ان کا انتخاب کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک اردو میں سانٹوں کا انتخاب شائع نہیں ہوا تھا۔ اس سلسلے میں حنیف کیفی نے احتشام حسین کو تحریر فرمایا تھا کہ فروغ اردو سے ان کے سانٹوں کے انتخاب کو شائع کروا دیں۔ احتشام حسین نے جواب میں لکھا :-

> "فروغ اردو" والوں کی یہ عزت افزائی ہے کہ وہ مجھے اپنا ادبی مشیر قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اب زیادہ تر صرف کورس کی کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ آج کل سب سے بڑی دشواری کتابوں کی اشاعت اور اس سے زیادہ نکاسی کی ہے۔ اسی وجہ سے پبلشرز صرف وہی کتابیں چھاپتے ہیں جنہیں آسانی سے بیچ سکیں۔

احتشام حسین کا ایک خط جناب عشرت قادری کے نام ہے۔ اس خط کے بارے میں جناب عشرت قادری فرماتے ہیں کہ "انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسہ میں تاج بھوپالی نے ایک غزل سنائی تھی۔ اس غزل کو عام طور پر ابہام سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ مرحوم احتشام حسین سے میں نے رجوع کیا تھا اور انھوں نے اس کی وضاحت سے سرفراز فرمایا تھا۔

احتشام حسین نے اس غزل پر اپنی تفصیلی رائے دی، جو خط میں موجود ہے۔ اس خط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس غزل کو بعض دوسرے احباب کو بھی دکھایا تھا تاکہ ان کی رائے معلوم کی جا سکے۔

احتشام حسین جناب عشرت قادری کو پسند کرتے تھے انھوں نے عشرت قادری کو ایک بڑی کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو بھی کیا تھا۔

احتشام حسین کا ایک خط آصف شاہمیری مرحوم کے نام ہے، جو ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو لکھا گیا تھا۔ یہ خط احتشام حسین کے مضمون " اردو ناول اور سماجی شعور " اور آل انڈیا ریڈیو اور اسکے بھوپال نشری مرکز میں اردو کی حالت سے متعلق ہے۔ آصف شاہمیری اور احتشام حسین کے قریبی تعلقات تھے۔ اور دونوں نے بمبئی کے ایک مباحثے میں ساتھ ساتھ شرکت کی تھی۔ آصف شاہمیری اپنے اصلاحی ناول "چوٹ پر چوٹ" میں احتشام حسین کا مضمون " اردو ناول اور سماجی شعور" شامل کرنا چاہتے تھے۔ اور احتشام حسین نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ یہ مضمون اس سے قبل ان کے مجموعہ مضامین " ذوقِ ادب اور شعور" میں شائع ہو چکا تھا۔ اب اس کا کچھ حصہ آصف شاہمیری کے ناول میں دوبارہ شائع ہوا ہے۔

احتشام حسین ہندوستان میں اردو کے محافظ بھی تھے اور ہر سطح پر اردو کی ترقی دیکھنا چاہتے تھے۔ " ریڈیو میں اردو " کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ریڈیو میں بہت آہستہ آہستہ اردو کی حالت کچھ بہتر ہو رہی ہے۔ ایک درخواست ادیبوں کی طرف سے لکھوا کر اور بہت سے دستخط کرا کے ڈاکٹر عابد حسین صاحب جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵ کے پتہ پر بھجوا دیجیے کہ بھوپال میں اردو کے پروگرام میں اضافہ کیا جائے۔ مجھے بھی مطلع کیا جائے۔

آصف شاہمیری نے احتشام حسین کے مشورہ پر عمل کیا۔ اس پر ریڈیو میں اردو کی ترقی کا جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر سید عابد حسین بھوپال تشریف بھی لائے تھے۔ آصف شاہمیری کے مضمون "کچھ یادیں کچھ باتیں " مطبوعہ الحمرا، بھوپال (۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء) میں احتشام حسین مرحوم سے ان کے تعلقات کا پُر اثر بیان موجود ہے۔

احتشام حسین کے رشتہ داروں اور عزیزوں کے نام چھ خط ہیں۔ افسوس، ان نجی خطوط کی تعداد زیادہ نہیں، ورنہ ان کے سوانح کی ترتیب میں یہ خطوط بہت کار آمد ثابت ہوتے۔ ان کے مکاتیب کے مطالعہ سے احتشام حسین کی نجی زندگی کی مصروفیت، اس کی ذمہ داریاں اور احساس فرائض کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ادبی حلقوں میں جس قدر محترم، معزز اور مقبول تھے۔

گھریلو زندگی میں بھی اتنے ہی ذمہ دار، فرض شناس اور معتبر تھے۔ احتشام حسین نے جناب احترام حیدر کے نام اپنے انتقال سے پانچ دن قبل خط میں نرجس خاتون عرف جمّا کی خیریت معلوم کی تھی، اور رضا تسنیم کے یہاں بچی پیدا ہونے کی خبر دی تھی۔ یہ خط ۲۹ نومبر کو احترام حیدر کو موصول ہوا۔ اسی دن انھوں نے احتشام حسین کو جواب دیا۔ ان لینڈ کا ایک حصہ نرجس خاتون کو جواب کے لیے دیا۔ ۲ دسمبر کو نرجس خاتون خط لکھ رہی تھیں۔

جناب بھائی صاحب قبلہ! آداب قبول فرمایئے۔

آپکا مسرت نامہ موصول ہوا۔ رضا کے یہاں ولادت بخیر و خوبی ہوگئی۔ بڑی مسرت ہوئی۔ خدا صاحبِ حیات نصیب کرے۔ اگر آپ نے اطلاع نہ دی ہوتی، تو مجھے یقینِ کامل ہے کہ ان کے یہاں سے کوئی اطلاع نہ دیتا۔

یہ خط ادھورا تھا کہ خبر آئی کہ خاندان بھر کا خیال رکھنے والا، "یقینِ کامل" کا مالک اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور نرجس خاتون جن کے یہاں ولادت ہونے والی تھی۔ آدھی جان ہوگئیں ایک ایک خط تلاش کرتیں اور روتے روتے بیدم ہو جاتیں۔ پھر خط کے خط جلا دیئے گئے، چھپا دیئے گئے اور بدنصیب نرجس خاتون اسپتال میں داخل کر دی گئیں۔ وہ زندہ ہیں، مگر احتشام حسین کے ناسور کے ساتھ۔

عمیق حنفی، ڈاکٹر شمیم حنفی اور عزیز اندوری اندور میں مقیم تھے۔ احتشام حسین نے ان حضرات کو بھی خطوط لکھے تھے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو عمیق حنفی کے خط کا جواب دیا تھا اور انکے تبادلہ کی منسوخی پر خوشی کا اظہار کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب "نئے تیشہ اور نئے کوہکن" کی بحث شروع ہوئی تھی۔ احتشام حسین، عمیق حنفی کے مضامین پسند فرماتے تھے۔ عمیق حنفی کو تحریر فرمایا:

آپ کے وہ مضامین جو فنون وغیرہ میں نکلے، اور یہ غزل والا مضمون دونوں پسند آئے۔ نظمیں بھی پڑھتے رہتا ہوں۔ اس میں کیا شک ہے کہ جدید شعراء میں آپ نے اپنی جگہ محفوظ کرلی ہے۔ دیر سے نہ گھبرایئے، آپ کی قدر

ہو رہی ہے اور ہو گی۔

عزیز اندوری نے فرسٹ ڈویژن میں ایم، اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالے کے موضوع سے متعلق خط لکھا تھا۔ احتشام حسین نے ان سے ملاقات کا ذکر خط میں کیا اور موضوع سے متعلق مشورے دیئے۔ اس خط میں انھوں نے سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر حنفی کا ذکر کیا ہے۔ اس خط میں کسی شاعر کا ذکر بھی ہے۔ جسکا نام عزیز اندوری نے پوشیدہ رکھا ہے۔ احتشام حسین کے نزدیک سردار جعفری پر پی ایچ ڈی تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر صرف ان کا "تصورِ وقت" مقالے کے لیے کافی نہیں۔ وہ مجنوں پر تحقیقی کام کرانے کے حق میں تھے اور اس کیلیے انھوں نے دلائل بھی پیش کیے تھے۔ لکھتے ہیں:

> مجنوں کے یہاں افسانہ، ناول اور تنقید تین اہم پہلو ہیں۔ ان کا رشتہ قدیم تاثراتی اور جمالیاتی گروہ سے بھی ہے اور ترقی پسندی سے بھی۔ خاصی گنجائش ہو گی۔ انھوں نے رسائل کی ادارت بھی کی ہے۔ معلّم بھی رہے ہیں اور فکر و خیال کا دائرہ بھی وسیع ہے۔

عزیز اندوری نے ایک خط کا ذکر کیا ہے۔ جس میں احتشام حسین نے مجنوں پر کام کرنے پر زور دیتے ہوئے معیاری مقالات کے مطالعے کا مشورہ دیا تھا:

> اس کے بعد آپ کو چند ایسے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو ایسے ہی موضوعات پر لکھے گئے ہیں، جیسے رشید احمد صدیقی پر ڈاکٹر سلیمان اطہر، وحید الدین سلیم پانی پتی پر، ڈاکٹر منظر عباس، مطالعہ امیر پر ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہو گا کہ مقالہ کی ظاہری شکل کیا ہو گی۔ ایسے موضوعات کے لیے جو فرد کے متعلق ہوں۔ سب سے مشکل کام حالات کے لیے صحیح مواد حاصل کرنا ہے۔ پھر اس شخص کو اس

۱۔ میرا جی اور دیشونت۔ اور دھرتی پوجا کے بارے میں دو مضامین۔

۲۔ میر صاحب اور نئی غزل

کے عہد میں ٹھیک مقام پر رکھنا۔ اس کے بعد اس کے خیالات و تصورات کا تفصیلی مطالعہ۔ اس کیلئے دو ایک جگہوں کا سفر بھی کرنا ہوگا۔ ان کے جاننے والوں، عزیزوں اور دوستوں سے ملنا ضروری ہوگا۔

عزیز اندوری کم وقت میں احتشام حسین کے قریب آگئے تھے۔ اندور میں احتشام حسین کے قیام اور مصروفیات کے علم کے لیے عزیز اندوری ایک اہم ذریعہ ہیں۔ انکا غیر مطبوعہ تاثراتی مضمون "احتشام اور میں" ایک یادگار مضمون ہے، جسکے لیے میں جناب مختار شمیم کا شکر گزار ہوں۔

احتشام حسین وکرم یونیورسٹی، اجین کے مختلف جلسوں میں شریک کار ہوتے۔ اور اجین کے ساتھ ساتھ بھوپال میں بھی قیام کرتے۔ ڈاکٹر عبدالودود ایک زمانے میں اجین میں مقیم تھے۔ ان کی احتشام حسین سے خط وکتابت تھی۔ ان کے علاوہ آفاق حسین صدیقی سے اور ایک طالبہ سے بھی جس کا ذکر مکتوب احتشام بنام ڈاکٹر ابو محمد سحر میں آیا ہے، خط وکتابت تھی۔ فی الحال ڈاکٹر ودود اور آفاق حسین صدیقی کے نام کا ایک خط ملا ہے۔

ڈاکٹر عبدالودود نے ڈی لٹ کے لیے اپنے مقالے کا خاکہ تیار کیا اور اسے احتشام حسین کی خدمت میں مشورہ کیلئے بھیجا۔ احتشام حسین نے اس خاکے پر مفید مشورے دیے تھے۔ احتشام حسین ڈاکٹر عبدالودود کے پی، ایچ، ڈی کے تحقیقی مقالے "اردو نثر میں ادب لطیف" کے ممتحن تھے احتشام حسین نے ان کے تنقیدی شعور اور محنت کی تعریف کی اور ساتھ ہی کچھ مشورے بھی دیے تھے۔ احتشام حسین، ڈاکٹر خلیل احمد کے تحقیقی مقالہ کے بھی ممتحن تھے۔ حنیف کیفی کا تحقیقی خاکہ بھی ان کی نظر سے گزرا تھا۔ انہوں نے حیدر عباس رضوی کو ایم اے کے لیے تحقیقی مقالے کا خاکہ نوٹ کر دیا تھا۔ ان کا مطالعہ میں نے اپنے مقالے "احتشام حسین اور تحقیقی مقالے" میں کیا ہے جو زیر اشاعت ہے۔

آفاق حسین صدیقی وکرم یونیورسٹی، اجین کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے موضوع کے انتخاب کے لیے احتشام حسین سے رجوع کیا۔ احتشام حسین کے جواب سے ان کے اندازِ فکر کا احساس ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

کچھ اپنی پسند کے موضوع تو لکھیئے۔ یہ اندازہ ہونا چاہیئے کہ افسانہ، ناول تنقید وغیرہ میں سے کس پر کام ہونا چاہیئے۔ پریم چند پر ہندی میں سیکڑوں مقالے لکھے گئے ہیں، اُردو میں چار پانچ۔ ان کے یہاں کوئی خاص پہلو ہو سکتا ہے[1]

پروفیسر آفاق احمد کے سلسلے میں احتشام حسین نے ڈاکٹر گیان چند کو بھی لکھا: "اور موضوعات بھی ہو سکتے ہیں، لیکن اچھا ہوتا کہ خود آفاق صاحب اپنے ذوق سے متعلق موضوعات کی نشاندہی کرتے"[2]

احتشام حسین مشوروں سے ضرور نوازتے تھے، ساتھ ہی یہ بھی چاہتے تھے کہ اساتذہ سے بھی مشورہ کیا جائے۔ آفاق حسین صدیقی کو لکھا کہ "پہلے اپنے استادوں سے مشورہ کر لیجیئے" احتشام حسین کے اپنے اصول اور اپنی قدریں تھیں، جو اُن کی بلند پایہ شخصیت کی عکاس تھیں۔

ڈاکٹر شیخ فرید نے زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس میں، جبل پور میں گزارا۔ وہ جبلپور یونیورسٹی سے وابستہ تھے اور وہیں سے پروفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل انجمن خیر الاسلام سے وابستہ ہیں۔ موصوف نے جبلپور سے تحریر فرمایا تھا کہ "مرحوم احتشام صاحب جبلپور تشریف نہیں لائے۔ ایک مرتبہ وہ بھوپال یا اجین سے واپسی پر جبلپور اترے اور دوپہر تک قیام کے بعد میں سے الہ آباد چلے گئے۔ ہم لوگوں کو خبر نہ ہو سکی۔ بڑا رنج ہوا۔ کوثر چاندپوری کے نام احتشام حسین کے کئی خط ہیں؟ ان میں سے چند خطوط اور ان کے اقتباسات کے مضمون "آبروئے زبان و ادب "پروفیسر احتشام حسین" میں شامل ہیں۔

کوثر چاندپوری بھوپال میں تھے، جب ان کا افسانہ "چور راستے" کتاب، لکھنؤ میں شائع ہوا اور سرفراز میں ان کے خلاف اداریے لکھے گئے تھے۔ احتشام حسین نے مدیر سرفراز کو، کوثر چاندپوری کی مدافعت اور موافقت میں خط لکھا اور بعد میں یہ مراسلہ شائع کروا دیا۔ کوثر چاندپوری کو خط میں لکھا کہ "آپ نے بہت سے افسانے لکھے ہیں اور آئندہ بھی لکھیں گے۔

۱۔ آہنگ گیا۔ جولائی/نومبر ۱۹۷۸ء : ۱۶۳

۲۔ ایضاً : ۱۶۹

ان میں سے ایک افسانہ کم ہو جائے، تو کوئی حرج نہیں۔" کوثر چاندپوری نے اعلان کے ذریعے "چور راستے" کو اپنی افسانوی تخلیقات سے خارج کر دیا۔ احتشام حسین اور کوثر چاندپوری کے بہت قریبی تعلقات تھے اور ان کے تاثراتی مضمون کے الفاظ اس کے شاہد ہیں۔

ڈاکٹر شفا گوالیاری، احتشام حسین کے عقیدت مند تھے اور ان کے باہمی تعلقات اچھے تھے۔ احتشام حسین نے شفا گوالیاری کے مجموعۂ کلام "زخم گل" کا مقدمہ تحریر کیا تھا۔ جو "شمعِ ادب" کے شفا نمبر میں شائع ہوا، اسی نمبر میں شفا گوالیاری کے نام احتشام حسین کے دو خط بھی شائع ہوئے ہیں، جو مقدمہ کی اشاعت اور "قلم کی تعمیل" سے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر شمیم حنفی، احتشام حسین کے شاگرد ہیں اور انھیں اپنے استاد کی محبت حاصل کرنیکا فخر حاصل ہے۔ ان کے نام احتشام حسین کے مکاتیب نیا دور کے احتشام حسین نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ ان سے استاد و شاگرد کے رشتے پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط میں قریبی تعلق، اپنائیت اور قربت کا احساس ہوتا ہے اور احتشام حسین کے مزاج کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ان خطوط میں احتشام حسین کی جیب سے "نکڑ"، انکی زندگی میں ایک رسالے کے احتشام نمبر نکلنے سے غیر دلچسپی، ایک ادارہ سے سفارش اور ناکامی، شمیم حنفی کے لیے فکرمندی، اور شمیم حنفی کے خود تحقیقی مقالے کا خاکہ بنانے کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

احتشام حسین کے کئی مکاتیب پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کے نام ہیں، جو ان کے مضمون میں شامل ہوئے ہیں۔ کچھ خطوط "فروغ اردو" کے احتشام حسین نمبر میں اور بعض نوائے سیفیہ میں بھی چھپے ہیں۔ احتشام حسین نے ان کی علمی ادبی کاموں میں حوصلہ افزائی کی۔ ان کی کتاب "بھوپال اور غالب" پر مراسلہ لکھا اور انہیں خط بھی لکھا۔

احتشام حسین نے مدھیہ پردیش کے ادیبوں اور شاعروں کی کئی کتابوں پر تبصرے کیے ہیں اور ان تبصرے کا اندازہ "بھوپال اور غالب" کے تبصرے سے کیا جا سکتا ہے۔ "بھوپال اور غالب" پر کئی رسالوں میں تبصرے شائع ہوئے ان میں سے بعض مخالفانہ بھی تھے۔ احتشام حسین نے اس کتاب کے سلسلے میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کو خط لکھا۔ پھر ایک خط "ہماری زبان"

میں شائع کروادیا، جو حسب ذیل ہے۔

عبدالقوی دسنوی نے غالب اور بھوپال کے سلسلے میں کئی مضامین شائع کیے ہیں اب وہ ان کی کتاب "بھوپال اور غالب" میں یکجا ہو گئے ہیں۔ موصوف نے محمد عباس شیروانی رفعت اور نواب یار محمد خان شوکت سے غالب کے استادی اور شاگردی کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے، دونوں بزرگوں کی تصانیف سے حوالہ دیکر غالب کے بعض تصانیف کا ذکر کیا ہے، جو میرے علم میں نہیں ہیں یا تو حضرات کا تسامح ہے، یا کتابوں اور نظموں کے دو دو نام ہیں۔ بہرحال عصری مواد ہونے کی وجہ سے قابلِ غور بات ہے۔ امید ہے کہ غالب شناس اس پر روشنی ڈالیں گے۔

عباس رفعت نے اپنی کتاب "نور دیدہ" میں جہاں معروف نام دیے ہیں وہاں "ماہِ نیم ماہ" "گوہر افشاں" "سبد چین" (یہ تو یقیناً سبد چین ہے) "روانِ شیریں" کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ انھیں ناموں کو نواب یار محمد خان شوکت نے بھی "انشائے نورِ چشم" میں دہرایا ہے۔ قوی صاحب نے کتابوں کے نام اور صفحات بھی دیے ہیں۔ اگر ہمعصر مواد میں یہ نام نہ آئے ہوتے، تو شاید زیادہ غور کرنیکی ضرورت بھی نہ تھی۔ ماہِ نیم ماہ کو سنی سنائی بات کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اور ناموں کی توجیہ کس طرح کی جاسکتی ہے؟"

احتشام حسین مصنفین کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ اور اعتراض بھی اس طرح کرتے تھے کہ مصنف کا حوصلہ پست نہ ہو۔ وہ ایک مروت پسند انسان تھے اور کسی کی دل شکنی ان کا

مقصد نہیں تھا۔

ایم عرفان، ڈاکٹر مظفر حنفی، اختر سعید خان، اشتیاق عارف تخلص بھوپالی، علی عباس امید، درگا پرشاد شاد، مدیر سیفیہ کالج میگزین، مجلۂ سیفیہ اور بعض دیگر حضرات کے پاس بھی احتشام حسین کے مکاتیب ہیں۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہ حاصل نہیں ہو سکے۔ کبھی اور مناسب موقع پر انہیں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کرشن چندر نے ایک جگہ لکھا تھا۔ "جب ہم خط لکھتے ہیں تو کاغذ کاغذ نہیں رہتا، سیاہی سیاہی نہیں رہتی، اس میں خونِ دل شامل ہو جاتا ہے۔" احتشام حسین کے ان مکاتیب میں بھی کچھ ان کے لہو کی آمیزش ہو گئی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

(تحریر نئی دہلی، اپریل جون ۷۶ء)

احتشام حسین اور مقدمہ نگاری

احتشام حسین کے انتقال کو دو سال گزر گئے[1]۔ اس درمیان میں ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر درجنوں مضامین لکھے گئے ہیں۔ مختلف رسائل نے احتشام حسین نمبر شائع کیے ہیں۔ احتشام حسین سے متعلق تحریروں میں ان کی ڈرامہ نگاری اور ڈرامے کی تنقید کو خاطر خواہ اہمیت نہیں ملی ہے۔ احتشام حسین نے "اندھیری راتیں" لکھ کر ڈاکٹر امرناتھ جھا سے سو روپیہ کا انعام جیتا تھا[2] اور "اندھیری راتیں" کے نام سے ہی وہ اپنے ڈراموں کا مجموعہ شائع کروانا چاہتے تھے۔ ان کی ڈرامہ نگاری اور ڈرامہ کی تنقید کے بارے میں میں نے اپنے مقالہ "احتشام حسین اور اردو ڈرامہ[3]" میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ حقائق کی روشنی میں جناب صباح الدین عمر صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے ڈرامے نہیں لکھے تھے نہ انہیں اسٹیج کرانے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے[4]۔" ادھر احتشام حسین کو ایک مثالی انسان بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی انسان دوستی، ان کی مروت اور انکی تبصرہ نگاری وغیرہ

---

[1] وفات: یکم دسمبر ۱۹۷۲ء (لطیف اعظمی)۔

[2] خلوص سراپا۔ پروفیسر فراق گورکھپوری۔ شاہکار (احتشام حسین نمبر) نومبر دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۴۳

[3] "احتشام حسین اور ڈرامہ" اخلاق اثر۔ سب رس دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۲۲

[4] ترنم (احتشام حسین نمبر) جنوری ۱۹۷۳ء ص ۱۲

کو مبالغہ سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی مروت اور شرافت کے بارے میں ایک روایت ہے کہ انھوں نے گھر کے دھوبی کی سفارش پر بڑھئی گیری کی کتاب پر پیش لفظ لکھا تھا[1]۔

ہنس راج رہبر تحریر فرماتے ہیں کہ

"ان کی رواداری کو قدرے مبالغہ آمیزی کے ساتھ یوں بیان کیا جاتا تھا کہ اگر کوئی آلو کی کاشت پر کتاب لکھ کر ان کے پاس لے جائے اور دیباچہ لکھنے کے لئے کہے تو وہ اس پر بھی ایسا ہی تعریفی دیباچہ لکھ دیں گے جیسا مبتدیوں کی شعر و شاعری یا افسانوں کی کتاب پر لکھ دیتے ہیں[2]۔"

احتشام حسین نے بہت سی کتابوں پر دیباچہ، مقدمہ اور پیش لفظ لکھے ہیں اور اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ احتشام حسین نے بہت سے تبصرے بھی لکھے ہیں۔ ان کی ایسی تحریروں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس موضوع کا کئی پہلوؤں سے جائزہ لیا جائے۔

احتشام حسین نے "تنقید اور عملی تنقید" کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ انھوں نے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف پر ہمت افزائی کے لئے تعریفی جملے لکھے ہیں۔ جن مصنفین نے احتشام حسین سے اپنی کتابوں پر پیش لفظ وغیرہ لکھوائے ہیں ان کے خیالات سے واقف ہونا ہمارے لئے مفید ہے۔

کوثر چاندپوری تحریر فرماتے ہیں :

احتشام صاحب پیش لفظ لکھنے میں بہت فیاض مشہور تھے۔ اکثر کتابوں پر انھوں نے پیش لفظ لکھے ہیں۔ میری کتاب "جہان غالب" پر بھی

---

[1] اقبال نعیب صاحب اور پروفیسر حید عباس رضوی صاحب کا خیال ہے کہ احتشام نے "مرغی خانہ" نام کی کتاب پر پیش لفظ لکھا تھا۔

[2] احتشام حسین انسان اور نقاد۔ ہنس راج رہبر آہنگ احتشام حسین نمبر جولائی، نومبر ۱۹۷۳ء ص

نہایت ہمت افزا رائے تحریر فرمائی تھی۔[۱]"

ہنس راج رہبر کا بیان ہے۔

"میں نے اپنی کتاب پر دیباچہ لکھنے کے لیے احتشام حسین کے پاس بھیجی۔ انھوں نے اوّل سے آخر تک پورا مسودہ غور سے پڑھا۔ نہ صرف مدلل اور مبسوط دیباچہ لکھا بلکہ الگ سے چند مشورے بھی دیے۔[۲]"

ڈاکٹر ظہیر مسعود کا اپنا تجربہ یہ ہے:

"دیوان غالب کا ایک عمدہ جیبی ایڈیشن شائع کرنا چاہ رہا تھا اور احتشام صاحب نے اس کا پیش نامہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں مقررہ تاریخ پر انکے گھر گیا تو پیش نامہ تیار نہیں تھا...... کچھ دن بعد احتشام صاحب نے "روزنِ در" کے خوبصورت نام سے ایک بہت خوبصورت پیش نامہ لکھ کر خود اپنے آدمی کے ہاتھ بھجوا دیا تھا۔ جو دیوان غالب کیساتھ چھپ گیا۔[۳]"

ڈاکٹر بشیشر پردیپ نے تحریر فرمایا کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے دوسرے مجموعہ "کاجل اور دھواں" کے ڈسٹ کور کے لیے چند سطریں لکھنے کے لئے کہا۔ احتشام صاحب نے جواب میں کہا کہ: اب آپ کو ضرورت نہیں ہے اس طرح کی تحریروں کی...... تھوڑی دیر کے بعد خود ہی بولے "کب تک چھپ رہا ہے آپ کا یہ مجموعہ"؟ میں نے بتایا تو کہنے لگے "اس کتاب کی دو تین کہانیوں کے مسودے بھجوا دیجئے گا، میں ڈسٹ کور کے لیے ایک نوٹ لکھ دوں گا۔[۴]"

نائب حسین نقوی نے اپنے تجربہ کو بیان فرمایا ہے کہ:

---

[۱] آبروئے زبان و ادب پروفیسر احتشام حسین۔ کوثر چاندپوری آہنگ احتشام حسین نمبر ص ۱۷۲

[۲] احتشام حسین انسان اور نقاد۔ ہنس راج رہبر آہنگ احتشام حسین نمبر ص ۷

[۳] احتشام حسین۔ ڈاکٹر ظہیر مسعود۔ نیا دور احتشام حسین نمبر ص ۱۳۹

[۴] پروفیسر احتشام حسین ــ ادیبوں کے محسن سب کے محبوب۔ ڈاکٹر بشیشر پردیپ ترنم احتشام حسین نمبر جنوری ۱۹۷۳ء

"انھوں نے مراثیِ انیس ترتیب دیئے تھے اور لاہور اور کراچی کے بعض علماء کی خواہش تھی کہ احتشام حسین اس کا دیباچہ تحریر کریں، نائب حسین نقوی صاحب نے احتشام حسین سے عرض کیا، وہ اگرچہ علیل تھے اس کے باوجود، ضرورت کے پیشِ نظر، بستر پر لیٹے لیٹے دیباچہ نوٹ کرادیا۔"[1]

ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ احتشام صاحب نے بغیر کسی اصرار کے پیش لفظ اور دیباچہ لکھ دیئے تھے۔ کچھ ناقدین کی تحریروں سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین دیباچہ پیش لفظ اور مقدمے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔

ڈاکٹر احراز نقوی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"کیسی ہی کتاب ہو، دیباچہ لکھنے سے انکار نہیں، چاہے وہ انجینیرنگ پر ہو یا محرم کے نوحوں پر۔ دیباچہ لکھنے سے انکار نہیں اور لکھنے کا یہ عالم ہے کہ بستر پر بیٹھ کر لکھ رہے ہیں، کھانے کی چھوٹی میز پر لکھ رہے ہیں خالی اوقات میں یونیورسٹی میں لکھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ٹرین دسل دے رہی ہے اور وہ محمود الحق رضوی کی لسانیات کی کتاب پر مقدمہ لکھ رہے ہیں۔"[2]

اختر بستوی کا بیان ہے کہ:

"ان کے بارے میں یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ کتابوں کے دیباچے لکھنے کے معاملے میں وہ بہت زیادہ غیر محتاط تھے اور جو بھی پرانا یا نیا ادیب یا شاعر ان کے پاس اپنی کسی تصنیف کا دیباچہ لکھنے کے لئے پہنچ جاتا تھا اسے وہ مایوس نہیں کرتے تھے۔"[3]

---

[1] سید احتشام حسین صاحب کی فکری اور شعوری قدریں، نائب حسین نقوی، ترنم۔ احتشام حسین نمبر جنوری ۱۹۷۳ء ص ۱۹

[2] میرے استاد احتشام صاحب۔ ڈاکٹر نقوی۔ فروغ اردو احتشام حسین نمبر فروری ۱۹۷۳ء ص ۱۰۳

[3] نئے لکھنے والوں کے بارے میں احتشام صاحب کا رویہ۔ اختر بستوی۔ فروغ اردو احتشام حسین نمبر فروری ۱۹۷۳ء ص ۱۱۵

ڈاکٹر وحید اختر بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"ان کی مروّت کسی کی دل آزاری گوارا نہ کرتی تھی۔ ان کی اس مروّت کا استحصال کرکے کمزور سے کمزور شاعر اور ادیب ان سے اپنی کتاب پر تعریفی پیش لفظ اور آرا لکھوا لیتے تھے۔ ایک زمانہ میں اپنی اس تنقیدی مروّت کی وجہ سے بدنام بھی ہوئے۔ [۱]"

پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ:

"وہ بڑے بامروّت آدمی تھے۔ ہم لوگ اکثر ان کے دیباچوں اور مقدموں کا مذاق اڑایا کرتے تھے اس لئے کہ اس معاملے میں ان کی فیاضی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے [۲]"

کچھ ناقدین ایسے بھی ہیں جنہوں نے حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن تحریر فرماتے ہیں کہ:

"وہ دوسروں کی سفارش سن لیتے تھے اور اکثر ان سے متاثر بھی ہو جایا کرتے تھے (مثال میں نہایت ادنیٰ قسم کے شعری اور افسانوی مجموعوں پر ان کے پیش لفظ پیش کئے جا سکتے ہیں) [۳]"

"ڈاکٹر محمد حسن نے "پیش لفظ" کے لئے "سفارش" کا ذکر کیا ہے تو ابنِ فرید نے "اصرار" کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مروّت احتشام صاحب کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ کسی کام کے لئے اگر ان سے اصرار کیا جاتا تو وہ مجبور ہو کر کر دیتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ

---

[۱] احتشام صاحب۔ ایک تاثراتی خاکہ۔ ڈاکٹر وحید اختر۔ نیا دور احتشام حسین نمبر ص ۹۳

[۲] احتشام حسین۔ کچھ یادیں کچھ تصویریں۔ آل احمد سرور۔ نیا دور احتشام حسین نمبر ص ۱۲۱

[۳] ترکِ احتشام۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ نیا دور احتشام حسین نمبر ص ۴۶

انکار کر رہے ہیں اور غرض مند اصرار کر رہا ہے۔ اس انکار اور اصرار میں ہمیشہ جیت اصرار کرنیوالے کی ہوتی تھی۔ یہی مروت تھی جس کی وجہ سے انھوں نے بہت سی ایسی کتابوں پر دیباچے لکھے جن کے بارے میں خود ان کی رائے اچھی نہیں تھی۔ ؎ "

حقیقت یہ ہے کہ احتشام حسین کے مزاج میں بلا کی مروت تھی۔ اس کے باوجود وہ نہ صرف عام بلکہ جانے پہچانے فنکاروں کی کتابوں پر پیش لفظ، مقدمہ لکھنے یا رائے ظاہر کرنے سے عموماً گریز کرتے تھے۔

میں نے یہ نتیجہ سرسری مطالعہ یا کسی تعصب کی وجہ سے اخذ نہیں کیا ہے۔ اس کے لئے میں نے ایک ایسے شاعر کا انتخاب کیا ہے جو نہ توصفِ اوّل کا شاعر ہے اور نہ غیر معروف۔ "گل نو" شعری مجموعہ ہے بڑھئی گیری کے فن پر کتاب نہیں۔ واحد پریمی فرنیچر کے ایک بڑے کارخانہ کے مالکوں میں سے ایک ہیں اور درجنوں بڑھئی اور دوسرے افراد ان کے کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ ان کا کلام نومبر یا دسمبر ۱۹۶۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ ۲۰ رجون ۱۹۶۰ء کو شفا گوالیاری سے شرف تلمذ حاصل کیا اور دو سال بعد ان کو فارغ الاصلاح قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں واحد پریمی نے اپنا مجموعۂ کلام شائع کرانے کا ارادہ کیا۔ اس وقت تک ان کا کلام سنگم (جموں)، بانگ سحر (سیالکوٹ)، شاعر (بمبئی)، آجکل (دہلی)، نگار (کراچی)، فاراں (کراچی)، تخلیق (دہلی)، صبا (حیدرآباد)، نیرنگ خیال (راولپنڈی)، نگارش (کراچی)، تلاش (دہلی)، کتاب (لکھنؤ)، منشور (کراچی)، محفل (لاہور)، تحریک (دہلی)، پگڈنڈی (امرتسر)، نیا پیام (لاہور)، آئینہ (لاہور)، سب رس (حیدرآباد)، تعمیر (سرینگر)، حرم (لاہور)، ہماری زبان (علی گڑھ)، دور حیات (بمبئی)، آثار (کلکتہ)، مجلس (لاہور)، اشارہ (پٹنہ)، نخلستان (اودے پور)، پونم (حیدرآباد)، نگارش (امرتسر)، پیکر (حیدرآباد)، صبح امید (بمبئی)، شاخسار (کٹک)، رہنمائے تعلیم (دہلی)، اور قلمکار (حیدرآباد) میں شائع ہو چکا تھا۔ بھوپال، جموں، کٹک اور لکھنؤ وغیرہ سے شائع ہونے والے شعری انتخابات

میں ان کا کلام شامل ہو چکا تھا۔

"گلِ نو" کے لئے آرا حاصل کرنے کے لئے واحد پریمی نے مختلف ناقدین اور شعرا کو خطوط لکھے تھے۔ اور جواب میں مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، آل احمد سرور، اختر اورینوی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر محمد حسن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور دوسرے بہت سے ناقدوں، محققوں شاعروں کی آرا حاصل ہو گئیں اور رائے کے انتظار میں "گلِ نو" تاخیر سے شائع ہوا۔ احتشام حسین اور واحد پریمی کی خط و کتابت ۱۹۶۰ء میں شروع ہو گئی تھی۔ بہت سے خطوط ضائع ہو گئے ہیں۔ جو باقی بچے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہو گا کہ احتشام حسین سے رائے حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۶۶ء کو احتشام حسین نے واحد پریمی کو تحریر فرمایا کہ:

"کاش آپ دیکھ سکتے کہ کتنی مصروفیت رہتی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ دیباچہ کی وجہ سے دیر نہ کیجیے۔ دنیا میں کوئی شخص دیباچہ یا مقدمہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ کتاب چھپ جائے تو میں قطعاً اس پر تبصرہ کر دوں گا۔ تبصرہ کی وقعت زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت اتنے کام ہیں کہ فوراً خدمت نہیں کر سکتا۔ امید ہے کہ آپ اسے عذر شاعرانہ نہیں واقعی مجبوری سمجھیں گے۔"

۲ر فروری ۱۹۶۷ء کو تحریر فرمایا کہ:

"اپنی مصروفیت اور الجھنوں کا کیا ذکر کر دوں۔ کوئی کام وقت پر نہیں ہو رہا ہے۔ آپ وزیر آغا صاحب سے مقدمہ لکھوائیے۔ میں بھی قطعاً چند سطریں لکھ دوں گا۔ اگر وزیر آغا صاحب لکھ دیں تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہو سکتی ہے۔ بہت سی رائیں یا درکھے فضول ہوتی ہیں۔ جو چیزیں آپ نے بھیجی تھیں میرے پاس محفوظ ہیں۔ پھر بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔"

۱۳ / مارچ ۱۹۶۷ء کو اپنی بیماری کا حال لکھتے ہیں:

"مزاج پرسی کے لئے ممنون ہوں۔ جی ہاں ۱۷ / فروری سے پڑا ہوا ہوں۔ بہتر ہو رہا ہوں۔ چند دنوں سے یونیورسٹی بھی آنے جانے لگا ہوں۔ لیکن ابھی چلنے میں تکلیف ہوتی ہے اور ہلکا درد ہر وقت رہتا ہے، کبھی بڑھ جاتا ہے۔ امید ہے کہ جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

۱۰ / اپریل ۱۹۶۷ء کو تحریر فرماتے ہیں:

"ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوں لیکن یونیورسٹی جانے لگا ہوں۔ حکم کی تعمیل چند دنوں میں ضرور کر دوں گا۔ امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔"

۲۴ / اپریل ۱۹۶۷ء کو "تعمیلِ حکم" کے لئے تاریخ تحریر فرمائی:

"اب تقریباً ٹھیک ہوں۔ ادھر یونیورسٹی کے بہت سے کام آپڑے ہیں۔ ۱۰ / مئی کے قریب تعمیلِ حکم کر دوں گا۔ امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔"

خدا خدا کر کے وہ گھڑی آتی ہے جب احتشام حسین اپنی رائے سے نوازتے ہیں اور کم از کم چھ مہینے کے بعد، بہت سی یاد دہانیوں کے بعد اپنی رائے سے نوازتے ہیں۔ ۲۲ / مئی ۱۹۶۷ء کو تحریر فرماتے ہیں:

"چند سطریں حاضر ہیں۔ آپ واقعی دھن کے پکے ہیں، میں آپ کی جگہ ہوتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہوتا۔ بہر حال خوش رہیے۔"

خط کے ساتھ رائے ملفوف تھی۔ تحریر تھا:

گزشتہ چند برسوں میں جن نئے شعراء نے مجھے اور دوسرے ادب دوستوں کو کسی نہ کسی حیثیت سے متوجہ کیا ہے، ان میں واحد پریمی بھی ہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان کی ریاضت اور فکر سخن کی عمر کتنی ہے۔

لیکن تین چار سال سے ان کی غزلیں موقر رسالوں میں ضرور دیکھ رہا ہوں جو پختگی، قدرت بیان اور کیفیت مجھے ان کی غزلوں میں ملتی ہے وہ اگر اتنی کم مدت میں برگ وبار لائی ہے تو یہ ان کی شاعرانہ فطرت اور شوقِ فراوانی کی دلیل ہے۔ روایاتِ فن کی پاسداری کے ساتھ ساتھ واحد پریمی کے بہت سے اشعار میں جدید ذہن کی خودنگری بھی نظر آتی ہے جو انفرادی شان بھی پیدا کرتی ہے۔

شاعر کے اس مجموعہ کو اس کسوٹی پر جانچنا مناسب نہ ہوگا جو ماہر اور پختہ کار شعراء کیلئے ہوتی ہے۔ لیکن اگر غزل کی شاعری میں رنگین اشاروں خوبصورت استعاروں، پرمعنی کنایوں اور دلکش خیالوں کی کوئی جگہ ہے تو یہ چیزیں اس مجموعہ میں مل جائیں گی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ واحد پریمی خود اعتمادی، لگن، رجائی اندازِ نظر کے ساتھ شاعری کے ایوان میں داخل ہوئے ہیں۔ یہ باتیں زندگی اور فن دونوں کو سنجیدگی سے برتنے اور سمجھنے پر مائل کرتی ہیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ انھیں کامیابی حاصل ہوگی۔[1]

نہ صرف شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کے بارے میں بلکہ شہروں کے بارے میں بھی احتشام حسین مشکل سے رائے دیتے تھے۔ احتشام حسین کو اہل بھوپال ہمیشہ سے عزیز رکھتے تھے۔ کانفرنس ہو یا کنونشن، مشاعرہ ہو یا کوئی اور ادبی نشست، رسائل کا اجراء ہو یا بزم ادب کا قیام ہر موقع پر ان کو یاد رکھا جاتا تھا، ان کو مدعو کیا جاتا تھا، ان کے پیغامات حاصل کئے جاتے تھے اور اہتمام سے شائع کئے جاتے تھے۔ ان کی آمد پر ایک ایک دن میں دو دو تین تین ادبی نشستیں ہوتی تھیں اور وہ اچھا تاثر لے کر بھوپال سے تشریف لے جاتے تھے۔ ملک کے موقر رسالوں میں بھوپال کے ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور محققوں کی تخلیقات پڑھتے تھے۔

[1] گلدستہ - واحد پریمی ص ۱۲

ان کا پہلا پیغام یکم جنوری ۱۹۵۲ء میں حمیدیہ کالج میگزین میں شائع ہوا[1] اور وہ پہلی بار یکم اکتوبر ۱۹۵۷ء کو بھوپال تشریف لائے۔ اس قدیم تعلق اور رشتہ کے باوجود جب "نوائے سیفیہ" کے لیے بھوپال کے بارے میں مختصر مضمون روانہ فرمایا تو تحریر فرمایا کہ:

"شرمندہ ہوں کہ اس سے پہلے یہ چند سطریں بھی نہ لکھ سکا۔ آپ سے کیا بتاؤں کس قسم کی مصروفیت رہتی ہے کبھی کبھی اپنی خبر نہیں ملتی۔ ادھر کچھ ڈیڑھ مہینہ سے طبیعت بے حد تھکی تھکی سی رہتی ہے۔"

۱۹۵۷ء میں ہی احتشام صاحب تقریباً دو دوروں میں پانچ چھ دن بھوپال میں مقیم رہے درجنوں ادبی نشستوں میں بھوپال کے فنکاروں کو سنا، اس کے باوجود مضمون میں تحریر فرمایا کہ کہہ چکا ہوں کہ کبھی زیادہ قیام کا موقع نہ ملا، اور چند گھنٹے ملے وہ بھی محفل سازی کی نظر ہو گئے، اس لئے میں کبھی بھوپال کی روح کے اندر جھانک کر نہ دیکھ سکا۔[2] "جب دوبارہ مضمون حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا تو تحریر فرمایا:

"...... بھوپال جب گیا گھوڑے پر سوار، نگاہ جما کر کسی چیز کے دیکھنے اطمینان سے کسی سے بات کرنیکا موقعہ تو کبھی نہ ملا۔ اچٹتے اچٹتے تصورات کے متعلق کیا لکھوں، باتیں یاد بھی نہیں۔ ایک آدھ صفحہ بہت قسم کے لکھ سکتا ہوں لیکن اس سے فائدہ؟ چند تاثرات اور چند دوستوں سے ملاقات وہ بھی بھاگ دوڑ کی حالت میں، اس کو کس شکل میں لکھوں، کچھ لکھے مگر آپ چاہتے کیا ہیں تو لکھ بھیجوں۔"

احتشام صاحب کی ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر یا شہر کے بارے میں بہت آسانی سے اظہار خیال نہیں فرماتے تھے۔ میں اصرار کرتا نہیں کہ اسے کلیہ تسلیم کر لیا جائے۔

---

[1] گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین ۱۹۵۲ء ص ۔۔۔ سے عنایت کردہ پروفیسر آفاق احمد

[2] بھوپال ایک تاثر ۔۔۔ احتشام حسین نوائے سیفیہ ۶۷، ۱۹۶۷ء ص ۔۔

ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ احتشام حسین کی رائے کے حصول کے پہلو کو بھی ذہن میں رکھا جائے اور احتشام حسین کو احتشام حسین رہنے دیا جائے۔ فرشتہ بنانے سے انکی بلندی میں کمی آجائیگی۔

احتشام حسین نے بہت سی کتابوں پر پیش لفظ، مقدمے اور تبصرے لکھے ہیں خود احتشام حسین ان پیش لفظوں اور تعارفوں کو تنقید کا درجہ یا مقام دینے کیلئے تیار نہیں۔ انھوں نے ایسی تحریروں کو اپنے ادبی اور تنقیدی مجموعوں میں شامل بھی نہیں فرمایا۔ تنقید اور عملی تنقید کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

بدقسمتی سے لوگ بعض نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف پر (زیادہ تر پہلی ہی تصنیف پر) ہمت افزا تعریفی خیالات اور چند جملوں میں لکھے ہوئے تبصروں کو تنقید کا مرتبہ دے کر یا تو دوست نوازی اور جانبداری کا الزام لگاتے ہیں یا سطحیت کا۔ لیکن انھیں اس کا تو اندازہ ہونا چاہیے کہ تنقید اور تعارف یا پیش لفظ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ موقع ملا تو اس پر کبھی تفصیل سے بحث کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس فرق کے پیش نظر میں نے کسی تعارف یا تبصرہ کو اپنی ادبی اور تنقیدی مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔ اس سے ایک دیانت دار مبصر کو تنقیدی مطمح نظر کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن نے ادنیٰ قسم کے شعری مجموعوں اور افسانوی مجموعوں کے پیش لفظوں کے بارے میں احتشام صاحب کا بیان نقل کیا ہے کہ "لوگ یہ تو دیکھ لیتے ہیں کہ پیش لفظ میں نے لکھا ہے یہ نہیں دیکھتے کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ پھر ان دیباچوں اور تقریظوں کو میں نے کبھی اپنے تنقیدی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اس سے بھی ان کی اہمیت ظاہر ہے۔[۱]" آل احمد سرور وغیرہ ان کے دیباچوں اور مقدموں کا مذاق اڑا ہی چکے تھے۔ ڈاکٹر محمود الہی ان کے دیباچہ کو نظر انداز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں:

---

[۱] تزک احتشام۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ نیا دور احتشام حسین نمبر ص ۶۱

"انھوں نے دوسروں کی کتابوں پر دیباچے بھی لکھے ہیں۔ ان سے صرف نظر کرنا ہی بہتر ہے کہ دیباچوں میں اکثر خیال احباب کا گزر ہو جاتا ہے۔ کوئی کتنا ہی بااصول اور دیانت دار نقاد ہو لیکن دیباچہ کی دنیا میں وہ مصلحت و شرافتِ نفس کا اسیر ہو جاتا ہے[1]۔"

ظفر ادیب نے احتشام حسین کی نظریاتی تنقید کے مطالعہ کے سلسلے میں مشورہ دیا ہے کہ مروت میں لکھی گئی تحریروں کو "الگ ہی رکھنا" بہتر ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

"مضامین کو اس صورت میں الگ ہی رکھنا ہوگا جو انھوں نے مروت اور رواداری میں لکھے۔ یہ دونوں باتیں ان کی سیرت کے بڑے اجزا کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور یہ ادب میں بھی نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ اسی لیے جب وہ کسی فنکار یا شخص کے بارے میں کچھ لکھتے تھے تو اس وقت ان کی وہ بے لچکی ان کے ساتھ نہیں رہتی تھی، جو ان کے دوسرے مقالات میں ان کی دامن گیر رہتی تھی[2]۔"

"احتشام حسین اور نئی نسل" (مطبوعہ آہنگ گیا، احتشام حسین نمبر ص ۶۸) میں عبدالمغنی نے ان کی دوسری تحریروں میں بھی جانب داری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ہم خیال ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فنکاروں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور ان پر زیادہ توجہ دیا کرتے تھے۔ اس لئے جب دوسری تحریروں میں بھی جانب داری موجود ہے تو صرف دیباچوں اور پیش لفظوں وغیرہ کو ہی مروت اور رواداری کی وجہ سے قابلِ اعتنا نہ سمجھنا مناسب نہیں ہے۔ کچھ ناقدین ایسے بھی ہیں جنہوں نے احتشام حسین کے مقدموں اور تعارفوں کو کافی اہمیت دی ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلام نے تحریر فرمایا ہے کہ "ان کے بیشمار کتابوں پر مقدمے

---

[1] دیدہ ور نقاد - ڈاکٹر محمود الٰہی - شاہکار (احتشام حسین نمبر) ص ۷۶-۲۷۵

[2] دیدہ ور ناقد - ظفر ادیب - شاہکار (احتشام حسین نمبر) ص ۲۹۵

و تعارف وغیرہ ہیں جو بذاتِ خود تصنیف سے کم درجہ نہیں رکھتے مثلاً مراثیِ انیس کا مقدمہ وغیرہ۔[1] عبداللطیف اعظمی نے ان کے مختصر تبصروں کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ: "میرے علم کے مطابق صرف احتشام حسین صاحب نے اس موضوع پر (یعنی تبصرہ نگاری پر) ایک مضمون لکھا تھا جو ۸ مارچ ۴۹ء کے "نئی روشنی" میں شائع ہوا ہے۔ اگرچہ مضمون مختصر ہے مگر سبھی پہلو زیرِ بحث آگئے ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے:

"ہم نے اس مضمون میں تبصرہ نگاری اور تبصرہ اور تنقید کے باہمی فرق پر پروفیسر سید احتشام حسین کے خیالات آٹھ کتابوں پر ان کے تبصروں کے نمونے پیش کئے ہیں، یہ کتابیں مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں نظم و غزل اور مضامین کے مجموعے ہیں اور سوانح حیات، ناول اور نفسیات پر کتابیں ہیں، مگر جس کتاب پر بھی تبصرہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے موضوع پر ان کی معلومات اور واقفیت بہت وسیع اور گہری ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی انکا موضوع ہے۔ اس سے مرحوم کے وسیع مطالعہ اور گہرے مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جو اردو کے بہت کم ادیبوں اور دانشوروں میں نظر آتی ہے"۔[2]

رائے سرسری بھی ہوتی ہے اور جچی تلی بھی۔ معرکۃ الآرا کی اہمیت سے بھی ہم واقف ہیں۔ احتشام حسین کی آرا ان کے پیش لفظ، مقدمے، تعارف اور تبصروں سے ان کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ "احتشام حسین کے تبصرے" پیش لفظ اور مقدمے شائع ہو جائیں تو ان کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ احتشام حسین کی ایسی ساری تحریروں کی اہمیت سے انکار کرنا مناسب نہیں ہے۔ ان کی ایسی تحریریں درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی طرح نہیں

---

[1] پروفیسر احتشام حسین مرحوم۔ ڈاکٹر محمد اسلام۔ فروغ اردو احتشام حسین نمبر ص ۹۰
[2] "احتشام حسین کے مختصر تبصرے" (عبداللطیف اعظمی۔ فروغ اردو احتشام حسین نمبر ص ۴۱ کے باقی صفحہ

ہیں جنہیں ہوائی فائر سے اڑا دیا جائے۔ احتشام حسین نے حوصلہ افزائی کی، خوبیوں کو نمایاں کیا، مثبت رویّہ اختیار کیا۔ انھوں نے قصیدے نہیں لکھے اور اگر قصیدے بھی لکھے ہیں تو ادب کا ایک عام طالبِ علم بھی انکی اہمیت سے واقف ہے۔

بقیہ حاشیہ ۳۲ - یہ مضمون جس کا اعظمی صاحب نے حوالہ دیا ہے، نہ تو "نگارشاتِ احتشام حسین" مطبوعہ آہنگ (گیا) کے احتشام نمبر میں شامل ہے اور نہ "احتشام حسین کے مضامین کی فہرست" مطبوعہ فروغ اردو (لکھنؤ) کے احتشام حسین نمبر میں۔ (اخلاق اثر) یہ صحیح ہے اور اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان دونوں مضامین کے لکھنے والوں نے یا تو روشنی کی فائل تلاش نہیں کی۔ یا ان کو مل نہ سکی۔ آہنگ کے مضمون میں سرے سے نئی روشنی کے کسی مضمون کا ذکر نہیں ہے۔ فروغ اردو میں صرف ایک مضمون "ادب کی تخلیقی تنقید" (مطبوعہ: ۲۴ر جنوری ۵۰ء) کا دو جگہ نامکمل عنوان اور نامکمل تاریخ کے ساتھ ذکر ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰ اور ۶۵) حالانکہ نئی روشنی ۱۶ر جون ۴۸ء سے ۲۴ر اگست ۵۰ء تک جاری رہا اور اس دو سال دو ڈھائی ماہ کی مدت میں "مختصر تبصرے" اور "ادب کی تخلیقی تنقید" کے علاوہ مرحوم کے جو مضامین اور تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کی تعداد کم از کم ۸ ہے۔
(لطیف اعظمی)

احتشام حسین اور اردو ڈراما

پروفیسر سید احتشام حسین اردو کے ان چند خوش نصیب ادیبوں میں سے ایک تھے جنہیں ان کی اپنی زندگی میں ہی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ ایک مستند عالم ناقد، محقق، ادیب اور انسان دوست تھے۔ اہلِ نظر ان کی علمیت کے حامل تھے اور خاص و عام انکی انسان دوستی کے دلدادہ تھے۔ ان کے انتقال پر تاثراتی اور تعزیتی پیغامات میں ان کی علمیت اور انسان دوستی کا خاص طور سے ذکر کیا گیا۔ ایسی تحریروں میں انکے اصل ادبی کارناموں سے زیادہ ان کی شخصیت اور ان سے وابستہ واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ فطری بھی تھا۔ تاثرات لکھے جا رہے تھے۔ پیغامات بھیجے جا رہے تھے مقالات قلمبند نہیں ہو رہے تھے۔ پھر بھی تاثرات یا پیغامات بالکل رسمی بھی نہیں ہوتے۔ ہر موقع پر ایک سی ہی باتیں بیان نہیں کی جاتی ہیں۔ ہر بات کی بنیاد ہوتی ہے اور جب اس حقیقت کا کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے تو تاثرات کی حالت چکبست کے ان شخصی مرثیوں جیسی ہو جاتی ہے جو کسی سے بھی وابستہ کئے جا سکتے ہیں۔

احتشام حسین کو تنقید اور تحقیق کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب سے گہری دلچسپی تھی درس و تدریس کی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے خاکے، افسانے اور ڈرامے لکھے۔ شاعری کی۔ عام ناقدین کی بات تو الگ ہے، وہ ناقدین بھی جنہیں تخلیقی ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ انہوں نے بھی احتشام حسین کی افسانہ نگاری، ڈراما نگاری اور شاعری کیطرف خاطر خواہ توجہ نہیں

دی ہے۔ بات یہاں تک آ پہنچی کہ ان کی ڈرامہ نگاری کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔ لکھنؤ سے شائع ہونیوالے اخبار "پانیر" اور ماہنامہ "ترنم" میں احتشام حسین کی ڈراما نگاری کے بارے میں بحث چلی اور یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ احتشام حسین نے نہ تو ڈرامے لکھے اور نہ انھیں اسٹیج کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اس حقیقت کے شواہد موجود ہیں کہ احتشام حسین کو ڈرامہ نگاری سے دلچسپی تھی اور یہ کہ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے تھے۔ احتشام حسین نے اپنے افسانوں کے مجموعے "ویرانے" کے طبقۂ اول کے دیباچہ میں اپنے افسانوں اور اپنی شخصیت کے بارے میں بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں اپنے شعور کی "حکمت اور جنوں" کی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے تحریر فرمایا:-

"میں نے متعدد افسانے لکھے۔ کچھ شائع ہوئے کچھ شائع نہ ہو سکے۔ بعض پسند کئے گئے بعض ناپسند، کچھ لوگوں نے دل بڑھائے اور کچھ نے ہمت شکنی کی، میں ہر طرح کے مضامین لکھ رہا تھا۔ ڈرامے اور نظمیں بھی لکھتا تھا۔"[۱]

ادب لطیف، لاہور کے مدیر نے احتشام حسین کو کچھ سوالات بھیجے تھے جن کے جوابات احتشام حسین نے دیئے تھے۔ بعد میں انھوں نے یہ تحریر "اعتبار نظر" میں شامل کر لی تھی۔ اس میں ایک سوال احتشام حسین کی شاعری اور افسانہ نگاری سے بھی متعلق تھا۔ اس کے جواب میں احتشام حسین نے لکھا کہ .... میں نے شعر اور افسانے بھی لکھے ہیں (افسانوں کا ایک مجموعہ دو تین بار چھپ چکا ہے) تنقید کے علاوہ بعض اور اصناف سے بھی دلچسپی لی ہے۔ شعر اب بھی کسی وقت کہہ لیتا ہوں۔ شاعری یا افسانہ نگاری چھوڑنے اور تنقید نگاری اختیار کرنے کا سوال نہیں۔ ممکن ہے پھر افسانے لکھوں یا شاعری کی رفتار تیز ہو جائے۔ ناول لکھنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ شروع میں کچھ ڈرامے بھی لکھے تھے اب بھی کسی وقت خواہش ہوتی ہے کہ کچھ ڈرامے لکھوں۔ تنقید کو خاص طور سے اپنانے کا سبب غالباً یہ ہوا کہ ۱۹۳۸ء میں جب یہ سارے کام بیک وقت جاری تھے۔ ملازمت ملی یونیورسٹی میں پڑھانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ پڑھانے کے

لئے کچھ زیادہ باقاعدگی سے پڑھنا پڑا..... زندگی کی دوسری فکروں کے بعد جو وقت بچتا تھا، اس ایک کام کے لئے کافی نہ ہوتا تھا۔ دوست احباب اخبار اور رسائل بھی تنقیدی مضامین کا مطالبہ کرنے لگے اور آہستہ آہستہ طلب و رسد کا اصول کام کرنے لگا۔"[1]

"ساحل اور سمندر" میں بھی امریکہ اور یورپ کے سفر کی روداد لکھتے ہوئے احتشام حسین نے اپنی شخصیت سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں ان سے بھی احتشام حسین کی ڈراما نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔

"یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں نے لکھنا شروع کیا، افسانے، ڈرامے، نظمیں تنقیدی مقالات، علمی مضامین سب کچھ"[2]

حقیقت یہ ہے کہ احتشام حسین نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے سے بہت پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا "ویرانے" کے دیباچہ میں خود انہوں نے تحریر کیا کہ :

"سنہ ۱۹۳۰ء کی سرگرمیوں میں جب ہائی اسکول کا امتحان دے کر انتظار کر رہا تھا تو وقت گزاری کے طور پر کوئی افسانہ یا ناول لکھنے کا خیال پیدا ہوا ناول تو خیر ارادے ہی کی منزل میں ختم ہو گیا لیکن دو یا تین افسانے میں نے ضرور لکھے"[3]

سنہ ۱۹۳۰ء میں احتشام حسین مذہبی موضوعات پر بھی لکھ چکے تھے۔ ہلکے پھلکے مزاحیہ خاکوں کے علاوہ افسانے بھی۔ سنہ ۱۹۴۳ء تک وہ بہت سے ڈرامے بھی لکھ چکے ہیں۔ "ویرانے" کے طبع ثانی میں احتشام حسین کی جن دوسری زیر اشاعت، زیر ترتیب، اور زیر تصنیف کتابوں کا ذکر ہے۔ ان میں ڈراموں کا مجموعہ "اندھیری راتیں" کا نام بھی شامل ہے۔ "اندھیری راتیں" کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین اس وقت تک کافی تعداد میں ڈرامے لکھ چکے تھے۔ اسٹیج ڈرامے کے علاوہ انھیں فلم اور ریڈیو ڈرامہ سے بھی دلچسپی تھی "روایت اور بغاوت"

---

[1] اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص ۱۵-۱۳ [2] ساحل اور سمندر احتشام حسین ص ۹ [3] ویرانے احتشام حسین

طبع ثانی میں احتشام حسین نے کچھ تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ اِن تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے
ریر فرماتے ہیں" اس تبدیلی کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن نظر ثانی کرتے ہوئے۔
ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑی سی ترمیم اس کی افادیت میں اضافہ کرے گی۔ چنانچہ اکبر الٰہ آباد
لِ قیل و قال میں" جو ایک ریڈیائی فیچر[1] کی شکل میں لکھا گیا تھا نکال دیا گیا۔ اس کے بجائے
دوسرے مضامین اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں[2]۔" حال ہی میں لکھنؤ میں قیام کے دوران
اب شجاعت علی سندیلوی، اردو پروڈیوسر، آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ نے میرے سوال کے جواب میں
یا تھا کہ احتشام حسین نے بہت سے ریڈیو ڈراموں کے علاوہ احتشام حسین نے ایک اور ڈرامہ
کبست آزادی کا پہلا شاعر" بھی لکھا تھا جو فروغِ اردو لکھنؤ کے ستمبر اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع
ہوا تھا[3]۔ تحقیق و تلاش کے بعد اور بہت سے ڈرامے روشنی میں آجائیں گے۔ احتشام حسین نے
ڈرامے لکھنے کے علاوہ اسٹیج اور فلم ڈراموں کا براہِ راست مطالعہ کیا۔" ساحل اور سمندر" کے صفحات
ان کے تبصرہ اور تاثرات شامل ہیں۔ اسٹیج، فلم اور ریڈیو ڈراموں سے متعلق انھوں نے کئی
مضامین لکھے" جدید اردو ڈرامہ[4]" "جدید اردو ڈرامہ اور اس کے بعض مسائل[5]" "ڈراموں میں
عدتوں کا مفہوم[6]" "آغا حشر کی ڈرامہ نگاری[7]" اور" نیا ہندی ناٹک[8]" ڈرامہ کی تنقید کا اہم
حصہ ہیں۔

احتشام حسین کی ڈرامے سے متعلق تنقید کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈرامہ
کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں تھے اور وہ اس کی عظمت کے لئے فکر مند تھے۔ وہ ڈرامے کیلئے
اسٹیج کی ضرورت اور مناسبت پر زور دیتے تھے اردو ڈرامے کے پچاس سال بیت جانے پر
بھی ڈرامے کے میدان میں کوئی حالی نذیر احمد، شبلی، سرشار، اقبال اور جوش کے نہ پیدا
ہونے کے شاکی تھے۔ یہ بات ضرور ہے کہ انھوں نے ڈرامہ کی جدید تحریکوں کا مفصل مطالعہ نہیں کیا تھا۔

---

[1] ریڈیو فیچر ریڈیو ڈرامہ کی ایک قسم ہے۔ [2] روایت اور بغاوت احتشام حسین [3] نگارشات احتشام حسین
پروفیسر عبد القوی دسنوی۔ آہنگ گیا۔ [4] ادب اور سماج۔ احتشام حسین [5] عکس اور آئینے احتشام حسین
آجکل ڈراما نمبر ۱۹۵۹ء [6] عکس اور آئینے۔ احتشام حسین [7] افکار و مسائل احتشام حسین [8] اعتبارِ نظر۔ احتشام حسین

انہوں نے ایک انٹرویو میں اینٹی اسٹوری سے متعلق سوال کے جواب میں کہا تھا۔

اینٹی اسٹوری، اینٹی ناول اور اینٹی تھیٹر وغیرہ منفی تحریکیں ہیں۔ میں نے ان کا زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے لیکن جو کچھ پڑھا ہے وہ اپنے مزاج سے ہم آہنگ نہیں پاتا اور اپنے ذہن سے مطابقت رکھنے والا نہیں پایا ہے۔[1]"

احتشام حسین نے مختلف اصناف ادب و فن پر طبع آزمائی کی اور ڈراما ان میں شامل تھا۔ انھوں نے اس وقت ڈرامے تخلیق کیے جب ڈرامہ "شریف فن" نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے ڈرامے پر تنقیدی مضامین اس وقت لکھے جب ڈرامہ پر لکھنے کی طرف عام طور سے لوگ متوجہ نہیں تھے۔ ان کے ڈراموں اور ڈراموں سے متعلق تنقید کا مطالعہ ایک شخصیت اور ایک عہد کا مطالعہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انکے ڈراموں کو یکجا کیا جائے۔ زمان و مکان کے احساس کے ساتھ انکا ہمدردی سے مطالعہ کیا جائے اگر ان کے ڈرامہ اسٹیج کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوں تو ان کو ضرور اسٹیج کیا جائے۔

---

[1] احتشام سے ایک انٹرویو۔ رام لعل، قاضی عبدالستار، عابد سہیل۔ کتاب اگست ۱۹۶۵ء ص ۱۱

(سب رس۔ حیدرآباد دسمبر ۱۹۷۳ء)

احتشام حسین اور فنِ افسانہ

احتشام حسین اُردو کے ان گنے چنے ناقدین میں سے ایک ہیں جنہوں نے تنقید اور تحقیق کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ احتشام حسین کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ انھوں نے مزاحیہ خاکے ڈرامے، نظمیں اور غزلیں بھی لکھیں۔ طالبِ علمی کے زمانے سے ہی تنقید میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ یونیورسٹی میں ملازمت کے بعد تدریسی تقاضوں کی وجہ سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ اس میں دوستوں ادبی رسالوں کے مدیروں اور ذاتی ذوق و شوق کو بھی دخل حاصل تھا۔

احتشام حسین نے افسانہ نگاری کئی بار ترک کی اور کئی بار اختیار کی۔ اس ترک اور اختیار میں انھوں نے افسانہ نگاری کو تنقید نگاری سے کمتر نہیں سمجھا۔ انھیں افسانہ نگاری ترک کرنے پر افسوس بھی ہوا اور تکلیف بھی۔ افسانہ نگاری چھوڑنے کے بعد بھی وہ افسانہ میں پوری دلچسپی لیتے رہے اور اس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعوں "عکس اور آئینے" "روایت اور بغاوت" "افکار و مسائل" "ادب اور سماج" "ذوقِ ادب و شعور" "تنقید اور عملی تنقید" "اعتبارِ نظر" میں شامل ہیں۔ افسانہ نگاروں اور افسانوی ادب سے متعلق ایسے مضامین کی تعداد تقریباً پندرہ ہے۔ ان مضامین کے علاوہ "ویرانے" کا دیباچہ ڈاکٹر شمیم حنفی کے سوانحی مضمون "احتشام صاحب" (کتاب فروری ۱۹۶۵ء) اور "احتشام حسین سے ایک انٹرویو" میں رام لعل، قاضی عبدالستار، اور عابد سہیل کے سوالوں کے جواب ہیں، احتشام حسین نے

افسانے سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے "نگارشات[1]" میں بھی احتشام حسین کی ایسی دس تحریروں (مضامین، انٹرویو، تاثرات، گفتگو) کی نشاندہی کی ہے جن میں افسانہ نگاروں اور افسانوی ادب کو موضوع بنایا گیا ہے۔

احتشام حسین کی افسانوی ادب سے متعلق تحریروں کے تنقیدی تجزیہ سے یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے افسانہ کے فن پر علیحدہ سے کوئی مضمون نہیں لکھا اور غالباً اسی وجہ سے احتشام حسین کے کچھ ناقدین کو یہ تاثر ملا کہ ان کو "نظریہ" زیادہ عزیز تھا۔ انھیں "فن" سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس نے احتشام حسین کے طریقۂ کار کو ذہن میں نہیں رکھا ہے۔

احتشام حسین نے اردو افسانہ کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا۔ ان کے سامنے، افسانوی تنقید کے لیے، چار راستے تھے اور ان میں سے ایک کو انھوں نے منتخب کر لیا۔ اس کا ان کے پاس جواز تھا۔ "اردو افسانہ (ہندوستان میں)" میں انھوں نے اپنے طریقۂ کار اور وجہ انتخاب کی وضاحت کی ہے:

> "ادب کی ہر دوسری صنف کی طرح مختصر افسانے کا مطالعہ بھی کئی نوعیتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ محض معروضی انداز نظر اختیار کر کے یہ دیکھا جائے کہ اردو کے مختصر افسانوں میں انسانی زندگی کے کون کون سے پہلو کس کس طرح پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں تنقید کے بجائے تجزیہ اور تحلیل سے کام لیا جائے تاکہ کچھ افسانوں کا حسن ہم پر آشکار ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ افسانوں کا مطالعہ افسانہ نگار کی نفسیات، اسکے تجربوں کی نوعیت اور مقصد اظہار کی روشنی میں کیا جائے تاکہ افسانہ اور افسانہ نگار دونوں کا مطالعہ ساتھ ساتھ ہوتا جائے۔ اس صورت میں تنقید سے پہلو تہی کی جا سکتی ہے

---

[1] نگارشات احتشام - احتشام نمبر آہنگ گیا۔

تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ افسانے کو ایک سماجی دستاویز کی حیثیت سے دیکھا جائے اور اس میں پیش کی ہوئی زندگی کی بنیاد پر قومی مزاج اور کردار کے بنیادی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس حالت میں افسانے کی فنی حیثیت پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ صرف اس کا مواد جاذب توجہ بنتا ہے اور چوتھا طریقہ یہ ہے کہ افسانے کے تاریخی ارتقاء کو بنیاد بنا کر، اوپر بیان کی ہوئی تمام صورتوں کو اس میں شامل کر لیا جائے یعنی موضوع کے انتخاب، ہئیت پر گرفت، مواد کی پیشکش اور مقصدِ اظہار کو افسانہ نگار کے شخصی رجحان اور سماجی شعور کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ فکر و فن کے ارتقاء کا اندازہ ساتھ ساتھ ہوتا چلے۔ یہ طریقہ اور کیسے کا جواب بھی دیتا چلتا ہے، مصنف یا افسانہ نگار کے خلوت خانۂ دل تک بھی پہنچتا ہے اور افسانے کے تفریحی پہلو یا لطف اندوزی سے محروم نہیں رکھتا۔[۱]

احتشام حسین کی اس تحریر سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ تیسرا طریقہ اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اس میں "افسانے کی فنی" خصوصیات پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی صرف اس کا مواد جاذب توجہ بنتا ہے اور وہ چوتھے طریقہ کو اسلیئے پسند کرتے ہیں کہ اس میں فکر و فن کے ارتقاء کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ احتشام حسین نے افسانے کے مطالعہ میں "تاریخی ارتقاء کو بنیاد بنایا اور اس میں ان کے اپنے "فکر و فن" کے تصورات واضح ہوئے۔ چونکہ ان کے مضامین میں "فنِ افسانہ" پر کوئی الگ سے تحریر نہیں ہے اس لیے اس مضمون میں احتشام حسین کے "نظریہ فن" سے متعلق تحریروں کو اپنی اصل حالت میں پیش کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے۔

احتشام حسین نے "افسانہ" کے ارتقاء، ترقی، کردار، مزاج، مقصد اور ماہیت میں فن کو پوری اہمیت دی ہے۔ انہوں نے افسانہ کی مخصوص خوبیوں اور فنی تقاضوں کے پیش نظر ہندوستان، ایران، چین اور عرب میں لکھے گئے قصوں کو جو مختصر افسانے سے یکسانیت

رکھتے تھے۔ افسانہ تسلیم نہیں کیا اور اس کی ابتدا "گذشتہ صدی" یا "انیسویں صدی" میں تلاش کی بلکہ یہ "صنعتی تمدن"[۱] کے اثرات کا پروردہ ہے۔" ایک نئے شعور کا اظہار اور ایک نئی دریافت ہے جو اپنی تہہ در تہہ معنوی خصوصیات کی وجہ سے کہانی کی اس ہیئت کا عکس معلوم ہوتا ہے جس کا ارتقاء انیسویں صدی کے یورپ اور امریکہ میں ہوا۔"[۲] "اردو افسانہ کی ابتداء اور نشو و نما کی کہانی بیسویں صدی کے ادبی شعور اور ذہنی ارتقاء سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے عناصر کے اشتراک اور سطحی مماثلت کے باوجود اردو کا مختصر افسانہ عصری تقاضوں ہی کا نتیجہ ہے۔"[۳]

اردو افسانہ کی ترقی میں دوسری زبانوں کے افسانوں کے ترجموں نے اہم حصہ لیا۔ فکر و فن کے نئے معیار سامنے آئے اور ان کے دور رس اثرات اردو افسانہ پر پڑے۔ احتشام حسین نے کئی جگہ ترجموں کا خصوصیت سے ذکر کیا اور ان کو اس لیے اہمیت دی کہ اردو افسانہ کا فن ان سے بہت متاثر ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں اردو میں شائع ہوئے افسانوں کے ترجموں کے اثرات کے بارے میں انھوں نے "اردو افسانہ" میں لکھا کہ پلاٹ بنانے کا شعور، ٹکنیک لکھنے کا ڈھنگ اور فنی لوازمات کی طرف توجہ دی جانے لگی۔"[۴] اردو افسانہ (ہندوستان میں) (۱۹۶۲ء) میں انھوں نے تحریر فرمایا:

> "اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے روسی، فرانسیسی اور انگریزی افسانوں کے ترجمے بڑی تیز رفتاری سے اردو رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ اور بہترین مغربی افسانوں کے معیار نگاہوں کے سامنے آگئے تھے۔ ان ترجموں نے موضوع کے انتخاب، پلاٹ کی تعمیر، ڈرامائی خاتمہ اور ٹکنیک کے تنوع کی طرف متوجہ کیا لیکن محض نقالی کی بجائے یہ اثر بڑی خاموشی سے افسانہ نگاروں کے شعور میں داخل ہو گیا۔"[۶]

۱؎ افکار و مسائل۔ احتشام حسین ص ۲۵۲ ۲؎ روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین ص ۱۳۷ ۳؎ ص ۲۰۳ عکس اور آئینے احتشام حسین ص ۹۵ ۵؎ اعتبارِ نظر۔ احتشام حسین ص ۱۵۲ ۶؎ عکس اور آئینے احتشام حسین ص ۱۰۱

احتشام حسین نے کچھ ناقدین سے اتفاق کرتے ہوئے افسانہ کو ادب اور صحافت کے درمیان ایک صنف کا درجہ دیا ہے[۱] اور دوسری جگہ موپاساں اور چیخوف کی افسانہ نگاری سے بحث کرتے ہوئے افسانہ نگاری کو "زندگی کی عکاسی، تشریح اور تعبیر"[۲] کہا ہے۔ تیسری جگہ یہ یاد دلایا ہے کہ "افسانہ زندگی کا ادبی نقش ہے"[۳]۔ ان کے نزدیک ایک کمتر درجہ کا افسانہ بھی حقیقت کے بغیر نہیں تخلیق کیا جا سکتا۔ "مادے کی دھندلی پرچھائیں کے بغیر حقیر سے حقیر افسانے کی تخلیق ممکن نہیں"[۴]۔ احتشام حسین کو اپنے نظریات پر صداقت کا یقین تھا اور ان کا عقیدہ تھا کہ افسانہ اور زندگی ایک حقیقت کے دو رخ ہیں چنانچہ انھوں نے افسانہ نگاری کا جائزہ اسی عقیدے کی روشنی میں لیا۔

"ہندوستانی زندگی دس سال میں کتنی بدلی ہے اس کا اندازہ ہندوستان کے افسانوں سے لگ جاتا ہے[۵]۔"

وہ ناولوں اور افسانوں کو زندگی کا مظہر کہتے ہیں "جب سے صنعتی تمدن کی ابتداء ہوئی ہے سائنس اور حکمت کی ترقی کا اظہار ہوتا ہے اس وقت سے ناولوں اور مختصر افسانوں میں زمان و مکان کی حقیقت اور صداقت کو عروج حاصل ہوتا ہے اور ہم اس صنف ادب میں زندگی کی پوری ہمہ بین کی حرکت صحت اور سچائی کے ساتھ تلاش کرتے ہیں"[۶]۔ احتشام حسین کی دوسری تحریروں میں یہ نظریہ زیادہ وضاحت سے پیش ہوتا ہے کہ انھیں حقیقت یا زندگی کی تصویر کاری عزیز ضرور ہے لیکن فنی قیود کا احترام بھی ضروری ہے :-

"حقیقت افسانہ کی روح میں گھستی ہوئی ہے بشرطیکہ افسانہ نگار محض داستان گو بنکر نہ رہ جانا چاہتا ہو۔ بلکہ انسانی روح کا انجینئر ہونے کی حیثیت سے اپنی بصیرت کے اظہار میں کوتاہی کا مجرم نہ ہونا چاہیئے۔ معمولی آدمی بڑا شاعر یا افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔ یہاں معمولی انسان کہہ کر کسی قسم کا طبقاتی

۱۔ افکار و مسائل - احتشام حسین ص ۲۵۲ ۲۔ اعتبار نظر - احتشام حسین۔ ص ۱۳۷-۱۳۶
۳۔ روایت اور بغاوت - احتشام حسین ص ۱۸۹ ۴۔ روایت اور بغاوت - احتشام حسین ص ۴۸ ۵۔ روایت اور بغاوت ص ۱۳۷

زینہ بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ شخص مراد ہے جس کی بصیرت معمولی ہے اور جس میں ذمہ دارانہ طور پر انسانی مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کا شعور نہیں سا ہے۔ نظام زندگی کو پوری طرح سمجھنا، ان تعلقات کی وجہ سے پیدا ہونیوالے تہذیبی ڈھانچے کو سمجھنا اور پھر ان سب کو زمان و مکان کی وسعت میں متحرک دیکھنا۔ یہی چیزیں انسانی کردار، اس کی امنگوں اور تمناؤں، اور اس کی فتح اور شکست، اس کی ترقی اور پسپائی کی صحیح تصویریں کھینچنے میں افسانہ نگار کی مدد کر سکیں گی اور وہ خود اعتمادی کے ساتھ معمولی معمولی واقعات میں زندگی کی پوری مشین کی حرکت دکھا سکے گا۔ افسانے میں اس مکمل حکیمانہ حقیقت کی آمیزش افسانے کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے بغیر اسے زندگی کے قریب کر دے گا،،[1]

احتشام حسین نے مختصر افسانہ کی کچھ خصوصیات بیان کی ہیں اور ان پابندیوں کا ذکر کیا ہے جو مختصر افسانہ کے لئے ضروری ہیں :

"مختصر افسانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو اپنی گہرائی اور حدبندی کے لحاظ سے زندگی کے چندہی عناصر پر مبنی ...... اور چند ہی پہلوؤں تک وسیع ہو سکتا ہے۔ اس کے مختصر خاکے میں چند کردار، چند واقعات اور چند مناظر سے زیادہ نہیں سما سکتے پھر چاہے کسی مخصوص ٹکنیک کی پابندی نہ بھی کی جائے تو وحدت زمان و مکان اور وحدت تاثر کا کسی حد تک خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اسلئے افسانہ نویس کو کبھی کبھی بہت دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے"[2]

انھوں نے مختصر افسانے کی خصوصیات بیان کی ہیں ان کے مطابق مختصر افسانہ طویل ہو سکتا ہے مگر اس کا خاکہ مختصر ہوتا ہے۔ اس خاکہ میں چند کردار، چند واقعات اور چند مناظر پیش ہوتے ہیں۔

---

۱ روایت اور بغاوت - احتشام حسین صفحہ ۱۰۶ ۲ تنقید اور عملی تنقید - احتشام حسین صفحہ ۲۹

وحدت تاثر کے لئے وحدت زمان و مکاں کا کسی حد تک خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ زندگی جو مختصر خاکہ میں پیش ہوتی ہے چند عناصر اور چند پہلوؤں پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی تکنیک کو اپنایا جا سکتا ہے۔ مختصر افسانہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔

مختصر افسانہ میں زندگی کا عمل طویل ہو سکتا ہے۔ کسی کردار یا کرداروں، ایک خاندان یا خاندانوں کے افراد کی زندگی۔ بچپن سے موت تک پیش ہو سکتی ہے مگر وحدت تاثر کے لئے افسانہ نگار۔ ایجاز و اختصار سے۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کسی خاص پہلو، کسی خاص گوشہ یا کسی خاص کردار کی مخصوص صفت، کیفیت یا نفسیات وغیرہ کے پر تاثر اظہار میں بروئے کار لاتا ہے۔ احتشام حسین نے جاندار کرداروں، زندہ تقریروں، زندگی کی مکمل ترجمانی، اعلیٰ نقوش اور گہرے خطوط کو اعلیٰ معیار تسلیم کیا۔ "ویرانے" کا دیباچہ ان کے خیالات کا آئینہ دار ہے۔

احتشام حسین نے افسانہ نگاری کیلئے چند بندھے ٹکے موضوعات نہیں پیش کیے بلکہ انہوں نے موضوعات کا انتخاب افسانہ نگاروں کے شعور اور رجحان پر چھوڑا اور ان پر فن کی پابندی عائد کی:

> "وہ اپنے رجحان کے مطابق موضوع چنیں گے۔ لیکن جب وہ اسے پیش کریں گے تو فن کے کچھ لوازم ہوتے ہیں ان کا احترام کریں گے۔ ان کو پیش نظر رکھیں گے۔ یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہ لکیر کے فقیر ہوں اور جس طرح سے دوسروں نے افسانے لکھے ہیں وہ بھی ویسے ہی افسانہ لکھیں۔ ان کا جی چاہے فن میں تجربہ کریں انسانی تجربوں کو ایسی شکل دیں جو انفرادیت کی حامل ہو لیکن انھیں اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان کا فن موضوع اور ذاتی تجربے عام لوگوں کے تجربہ کی دسترس میں آجائیں۔"[1]

اس اقتباس میں کئی اہم باتیں بیان کی گئی ہیں۔ موضوع کے انتخاب میں اور فن میں تجربوں کے لئے افسانہ نگار کو آزادی عطا کی گئی ہے۔ فنی لوازمات کی پابندی پر اصرار کیا گیا ہے۔

---

[1] اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص ۱۶۹

ساتھ ہی اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ افسانہ نگاروں کا فن، موضوع اور ذاتی تجربے عام لوگوں کے تجربے سے بہت مختلف نہ ہوں۔ ان کی پہنچ سے بالاتر نہ ہوں۔ موضوع کے بارے میں تو احتشام حسین نے کہدیا تھا کہ "کوئی موضوع جو ہم کو بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ ادب کا موضوع نہیں بڑا موضوع ہو سکتا ہے...... جس بات پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی موضوع ادب میں بذات خود اہم یا غیر اہم نہیں ہوتا بلکہ اس موضوع کو پیش کرنیکا طریقہ اسے اہم بناتا ہے"[1]

جہاں تک ذاتی تجربے کی بات ہے، احتشام حسین نے نئے افسانہ نگاروں سے اس بات شکایت کی تھی کہ "اس وقت تک انھوں نے اپنے ذاتی تجربوں کو کسی آفاقی تجربہ سے ملانے کی پوری کوشش نہیں کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کام کسی خاص طرح کے میکانکی عمل سے نہیں ہوگا...... ہر واقعہ انسان کی زندگی میں ایک بڑے طربیہ یا المیہ کی بنیاد بن سکتا ہے لیکن اگر انفرادی طور پر الگ کر کے بیان کیا جائے تو اس کی حیثیت ایک تنہا اور مجرد تجربے کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس حالت میں افسانہ عظیم نہیں بن سکتا"[2] انھوں نے مزید لکھا کہ

> "جو شخص تخلیقی ادب یعنی افسانے اور ناول کا مطالعہ کرتا ہے وہ واقعات کو واقعات کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے کہ تا کہ وہ انفرادی اور محدود ہوتے ہوئے بھی بہت سے دوسرے واقعات کا نمائندہ اور ترجمان بن جائے"[3]

احتشام حسین کے مذکورہ اقتباسات میں "ذاتی تجربے" "مجرد تجربے" اور علامتی اندازِ بیان مخصوص انداز اور مخصوص مضمون میں استعمال ہوئے اور بعد میں ان پر مباحث کے دروازے کھلے۔ ذاتی تجربے اور آفاقی تجربے، مجرد تجربے اور علامتی اظہارِ بیان کا تعلق اور سلسلہ ترسیل سے جڑا ہوا ہے۔ رام لعل، قاضی عبدالستار اور عابد سہیل نے احتشام حسین سے ایک انٹرویو لیا تھا (کتاب اگست ۱۹۶۵ء)

رام لعل نے تجریدی آرٹ یا غیر تجریدی کہانیوں کو غیر ترقی پسند کہے جانے کے بارے میں ان سے سوال کیا تھا۔ اس سوال کے جواب سے احتشام حسین کے ترسیل کے نظریہ کی وضاحت ہو جائے گی۔ انھوں نے جواب میں کہا تھا کہ:

---

[1] اعتبارِ نظر۔ احتشام حسین ص ۱۵۵-۱۵۴ [2] اعتبارِ نظر۔ احتشام حسین ص ۱۶۳-۱۶۲ [3] اعتبارِ نظر احتشام حسین ص ۱۶۵-۱۶۴

"ترقی پسندی سے اگر ہم وہ ادب مراد لیں جو وقت کے تقاضوں کا خیال رکھتا ہے تو میرے خیال میں تجریدی شاعری اور آرٹ کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ اس وقت نقصاندہ ہو جاتا ہے جب تجرید کی وجہ سے ترسیل خیال ناممکن ہو جائے۔ ایسی صورت میں اسے ترقی پسندوں یا دوسروں کے پسند یا ناپسند کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ ایسے ادب، فن یا شاعری سے گہری وابستگی ممکن نہیں جو دل کے تاروں میں جھنکار نہ پیدا کرے۔ اگر علامتی شاعری جذباتی طور پر آسودگی بخشتی ہے تو اسے ناپسند کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن ایسی صورت میں علامتوں کا استعمال ایسی تجریدی کیفیت کے اظہار کے لئے نہ ہونا چاہیئے کہ اس کے معنی سمجھ میں نہ آسکیں اور رابطہ قائم نہ رہ سکے۔ برخلاف اس کے پروپیگنڈائی ادب بھی انتشار کے زمانے میں اہمیت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ وہ ذہن کو کریدتا ہے۔ اگر علامتوں کا استعمال محض ایک مخصوص گروہ کی ذہنی آسودگی کے لئے ہو تو وہ ادب میں مقبول نہیں بن سکتیں، علامتوں کو عام خیالات کا ترجمان بننا چاہیئے تاکہ وہ اپنا مقصد پورا کریں"[1]

احتشام حسین نے رام لعل کے ایک اور سوال "علامتوں کی شکل الگ الگ لوگوں کیلئے الگ الگ ہوتی ہے" کے جواب میں فرمایا تھا:

"علامتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی۔ طوفان۔ دستِ صبا گلشن وغیرہ ایسی علامتیں ہیں جن کی طرف ہمارا ذہن فوراً منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم ایسی علامتیں بنائیں جو صرف ہماری ذاتی نفسیات کی مظہر ہوں تو ان تک دوسروں کی رسائی مشکل ہو جائے گی (PERSONAL SYMBOL) میں عام طور سے ترسیل خیال کا عمل بیحد محدود ہو جاتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایسی علامتیں جو بہت SUGGESTIVE ہوتی ہیں آفاقیت بھی کر لیتی ہیں"[2]

---

[1][2] احتشام حسین سے ایک انٹرویو۔ رام لعل۔ قاضی عبدالستار۔ عابد سہیل۔ کتاب اگست ۱۹۶۵ء ص۱

علامتی شاعری ایک تحریک کی حیثیت سے جدید ضرور ہے لیکن ادب میں علامتوں سے کام ہمیشہ لیا جاتا رہا ہے۔"

احتشام حسین نے ترسیل خیال کو بہت اہمیت دی اور اسے "بنیادی مسئلہ کہا۔ لکھنے والو کے لئے بنیادی مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی تجربوں کو، اپنی ذاتی معلومات کو، اپنے ذاتی سوچ اور غور کرنے کے طریقوں کو جب کسی ایسے سانچے میں ڈھالنا چاہیے جسکو وہ دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے اس بڑی دنیا سے ہم آہنگ کرے جو اس کے گرد و پیش ہے۔ اگر وہ اس میں ناکام رہتا ہے تو اس حد تک اس کا فن محدود ہو جاتا ہے۔ یہاں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ چاہے کوئی بڑے سے بڑا لکھنے والا ہو اس کے پڑھنے والے چاہئیں وہ لوگ لکھنے والے کے تاثرات میں شریک ہو سکیں۔"[1]

اس طرح احتشام حسین نے قابل فہم اندازِ بیان اور ایسا علامتی انداز اختیار کرنے پر زور دیا ہے جس سے ترسیل خیال ممکن ہو اور افسانہ میں آفاقیت پیدا ہو سکے۔ جب ترسیل کے عمل کو ذہن میں نہیں رکھا جائے گا تو تخلیق ادب ایک معمہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

> "لفظ و معنی میں کوئی ایسا انوکھا تعلق پیدا کرنا۔ ایسی علامتیں بنانا یا لفظوں سے ایسی مصوری کرنا جو سماجی حیثیت نہ رکھے افسانہ نگار کے لئے مناسب نہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے مقصد سے دور جا پڑے گا اور اچھے تخلیقی ادب کے بجائے ایک معمہ دے جائے گا جسے پڑھنے والے حل کرتے رہیں گے۔"[2]

احتشام حسین نے افسانے کی زبان کے بارے میں مختلف مقامات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ لطافت و رعنائی، تازگی اور شگفتگی شعریت اور اظہار کی روانی، ہلکے پھلکے اشارے اور کنارے تشبیہوں اور استعاروں کا قابل فہم اور انوکھا استعمال افسانے کو قبولیت عام بخشتا ہے۔ آفاقیت عطا کرتا ہے۔ اس اسلوب کی خوبیوں کے ساتھ انھوں نے ان ذرائع پر بھی روشنی ڈالی ہے جن سے افسانوں میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ عملی تنقید کے نمونوں سے بخوبی ہو جائے گا۔

---

[1] اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص۱۶۱ [2] تنقید اور عملی تنقید۔ احتشام حسین ص۵۶-۵۷

احتشام حسین نے مقصدیت "اور افسانہ نگار کی شخصیت کے تعلق سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ وہ لوگ بھی حقیقت نگاری کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی اپنے نظریات اور تصورات سے اپنی تخلیقات کو محفوظ نہیں رکھ پاتے انھوں نے لکھا کہ :

"افسانے کی تخلیق میں میں کسی غیر شعوری جذبے کی کارفرمائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نہیں مانتا کہ کوئی افسانہ نگار کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے اور لاشعور کی تحریک پر ایک افسانہ لکھ دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کو CONSTRUCT کرتا ہے، تعمیر کرتا ہے۔ اس کا عمل تعمیری، تخلیقی اور شعوری ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اسے اپنے خام مواد کو ایسی شکل میں پیش کرنا پڑتا ہے جو اس کے خیالات اور جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ یہ وہ نہیں کر سکتا کہ اپنے جذبات اور ضمیر کی آواز کے خلاف اسے وہاں جا کر ختم کر دے کہ جہاں اس کا ضمیر اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا ہو۔"[1]

"افسانہ میں نفسیات کا عنصر" میں احتشام حسین نے مقصدیت پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے "دنیا کے قدیم اور جدید اعلیٰ ادب کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ لکھنے والے کا پورا نقطۂ نظر پوری طاقت اور پوری لطافت کے ساتھ ادب کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے" یا "ادیب کا مقصد کسی نہ کسی طرح اس کے تخلیقی یا تو مینچی کارناموں میں داخل ہو جاتا ہے۔"[2]

"اردو افسانہ (ہندوستان میں)" میں وہ افسانہ نگار کی شخصیت، اس کے افسانے پر اس کے اثرات، افسانہ نگار اور قاری کے رشتہ اس کی اہمیت اور افادیت پر اظہار خیال کرتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ اصل افسانہ فنکار کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ یہ شخصیت موضوع کے انتخاب سے لے کر فنی تخلیق کی آخری منزل تک انفرادیت اور آفاقیت میں رشتہ جوڑنے میں

---

[1] اعتبار نظر - احتشام حسین ص ۱۶۲-۱۶۳ [2] تنقید اور عملی تنقید - احتشام حسین ص ۵۱-۵۰

مصروف رہتا ہے جس سے فنکار اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان رشتہ قائم ہوتا ہے۔ جو افسانہ نگار اس راز کو جتنا زیادہ سمجھتا ہے اتنا ہی کامیاب ہے۔ زندگی کی توسیع دنیا میں اچھی دنیا کی تخلیق اس طرح ہونا چاہیئے کہ تنوع میں قدرت کا تصور پیدا ہو۔ یہ بات موضوع سے گہری واقفیت، زبان پر قدرت، فن کے شعور اور عقیدے کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس بات پر وہ دوسروں سے زیادہ ہمارے افسانہ نگاروں کو غور کرنا چاہیئے"[1]

احتشام حسین نے ہر موقع پر اور ہر لمحے فنی شعور، فنی لوازمات اور فنی ضرورتوں اور تقاضوں کا خیال رکھا ہے۔ مقصد کے بغیر کوئی اعلیٰ تخلیق ناممکن ہے اور مقصد کے بھدے اظہار سے فن کا خون ہوتا ہے"[2] انھوں نے افسانہ نگاروں کو حیات انسانی کے مطالعہ اور فنی ضرورتوں کے التزام کی طرف متوجہ کیا۔ اور ان کی خوبیوں کو ادب العالیہ کی تخلیق کے لئے ناگزیر کہا۔" وہ حیات انسانی کا گہرا مطالعہ کریں اور فن کی ضروریات پر نظر رکھتے ہوئے ایسے افسانے لکھیں جن سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات اور سماجی زندگی کے راز کھلیں۔ کل ایسے ہی کارناموں کا شمار ادب العالیہ میں ہوگا"[3] وہ ایک افسانہ نگار کی عظمت کی بنیاد میں فن کو بھی شامل کرتے ہیں:

"ایک افسانہ نگار کی اہمیت عظمت اور کامیابی کا تعین زندگی پر اس کی گرفت، مشاہدے کی طاقت، فنی چابکدستی اور مقصد کی بلندی سے ہوتا ہے"[4]

افسانہ کی اہمیت ان کیلئے اس لیے بھی ہے کہ اس میں فن اپنی تمام نزاکتوں کے ساتھ جلوہ فگن ہوتا ہے:

"فن کی ایسی متنوع نزاکتیں اور رنگارنگ باریکیاں کسی دوسرے شعبہ ادب میں پیش نہیں کی جاسکتیں۔ ایسے تخلیقی کارناموں کو معمولی چیز سمجھ کر نظر انداز کرنا یا غیر اہم سمجھنا صرف بدذوقی ہی نہیں بلکہ ترقی کے صحت مند سوتوں کا منھ بند کر دینا ہے"[5]

۱؎ عکس اور آئینے۔ احتشام حسین ص ۱۰۱
۲؎ ادب اور سماج۔ احتشام حسین ص ۴۳
۳؎ ادب اور سماج۔ احتشام حسین ص ۴۰
۴؎ تنقید اور عملی تنقید۔ احتشام حسین ص ۵۰
۵؎ عکس اور آئینے۔ احتشام حسین ص ۴۳

احتشام حسین کو افسانہ کے فن کی عظمت عزیز تھی "نئے ادبی رجحانات" میں انھوں نے اسی غرض سے نئے ادیبوں کی فنی لغزشوں پر گرفت کی۔ "کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ادب یا شاعر فن کے لوازم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے گہرائی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا اور فنی کمزوریوں کا اظہار کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی وہ خطیبانہ اور واعظانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی لفظوں اور اصطلاحوں کے استعمال ہی کو کافی سمجھ لیتا ہے۔ کبھی اپنی بے مائیگی کو نئی نئی اصطلاحوں کے پردے میں چھپا دینا چاہتا ہے کبھی معمولی اور بھدی چیزوں پر زور دے کر اسے جدت سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن تجربہ کے دور میں یہ سب ممکن ہے[1]" ان کی اس گرفت میں ہمدردی کا جذبہ بھی شامل تھا۔ ان کی باتوں میں خلوص تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے مقصد کو واضح الفاظ میں بیان کیا:۔

"جس بات کو میں بار بار دہرا چکا ہوں اسے پھر سے کہدینا چاہتا ہوں کہ ابھی اس ادب کی ابتداء ہے۔ ابھی تو بہت کچھ سیکھنا ہے۔ بہت کچھ تبدیلی کرنا ہے اور بہت سی گہری حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنا ہے اور اس سلسلہ میں انھیں فن کی لطیف ترکیبوں سے مدد لینا پڑے گا۔ جو چیزیں رجحانات کے طور پر ظاہر ہو رہی ہیں انھیں ادب کا جزو بن جانا ہے۔[2]"

احتشام حسین نے جہاں افسانہ نگاروں کو فن میں تجربے کی اجازت دی وہاں انھوں نے ٹکنیک کو افسانہ نگاروں کا ذاتی طریقہ اور ——— بتایا کہ موضوع اور ٹکنیک کے لحاظ سے افسانہ کی کائنات کافی وسیع ہے۔

"موضوع اور مواد کو پیش کرنے کی ٹکنیک اظہار کا ذاتی طریقہ ہے۔ موضوع اور ٹکنیک کے لحاظ سے جسے مختصر افسانہ کہا جا سکے اس کی حدیں کافی وسیع ہیں۔۔

---

[1] تنقیدی جائزے - احتشام حسین ص۹۷

[2] تنقیدی جائزے - احتشام حسین ص۹۸

اچھا لکھنے والا جب اپنے انداز سے اپنا مواد پیش کرتا ہے تو اس کی ٹکنیک الگ ہو جاتی ہے۔ کوئی تفصیلات میں جاتا ہے، کوئی واقعات کو مختصر طریقے سے پیش کرتا ہے۔ کوئی کردار کو ابھارتا ہے۔ کوئی پس منظر کو کم نمایاں کرتا کرتا ہے کوئی فضا اور تاثر پر زور دیتا ہے۔ کوئی مرکزِ خیال پر۔ یہی سارے جدید افسانہ نگار کر رہے ہیں۔"[1]

افسانے کے بارے میں احتشام حسین نے جن نظریات کو پیش کیا تھا افسانوں کی عملی تنقید میں انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ ان کی عملی تنقید کے کچھ معیار و میزان پیش ہیں۔ ان میں سے کچھ کی جھلکیاں تو پہلے ہی سامنے آچکی ہیں۔ اور ان میں کچھ نئے خیالات بھی شامل ہیں۔

احتشام حسین نے "ویرانے" کے دیباچہ میں اپنے ہی افسانوں پر تنقید و تبصرہ کیا ہے وہ اپنی فنی صلاحیت کو اعلیٰ درجہ کی نہیں کہتے مگر ان کو یہ یقین ہے کہ انھوں نے افسانوں میں زندگی کی جھلک ضرور پیش کی ہے:

"اس کی فنی صلاحیتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں، اس کے نقوش اور خطوط گہرے نہ ہوں، اس کی تصویروں میں رنگ دھندلے ہوں، اس کے کردار بے جان ہوں۔ اسکے اشارے مبہم ہوں اور اس کی زندگی کی ترجمانی ناقص ہو پھر بھی اپنی بساط بھر اس نے اس کی کوشش ضرور کی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی وہ جھلک تھوڑی بہت ضرور دکھا سکے جسے اس نے دیکھا اور سمجھا ہے۔"[2]

احتشام حسین نے افسانوں میں "زندگی کی جھلک" کو بہت اہمیت دی۔ وہ اعلیٰ فنی صلاحیت گہرے نقوش و خطوط، تصویروں کے روشن رنگ اور واضح اشاروں کے قائل ہیں۔ افسانوں میں جاندار کرداروں کی پیش کش پسند کرتے ہیں۔ کردار نگاری کے تعلق سے انھوں نے اپنے

---

[1] اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص۱۲۱ [2] ویرانے۔ احتشام حسین ص۸

ایک انٹرویو میں بہت اہم باتیں کہی ہیں۔[1] ان کا اظہار ان کے نظریات کو سمجھنے میں مدد دے گا۔
قاضی عبدالستار نے پوچھا ...... چند سال قبل تک ہمارے ملک کی آبادی (WATER TIGHT) طبقات میں بٹی ہوئی تھی اور ہمارے یہاں افسانوی ادب میں فرد سے زیادہ (TYPE) پر زور دیا جاتا تھا۔ مثلاً اگر کوئی کسان ہے تو وہ کیسا بھی خراب کیوں نہ ہو اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی زمیندار ہے تو چاہے وہ کیسی ہی خوبیوں کا مالک کیوں نہ ہو اسے خراب سمجھا جاتا تھا۔ پہلے کے ادیبوں نے ان دونوں کو فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کے طبقاتی رشتہ کے پس منظر میں دیکھا تھا۔ جبکہ آج کی نسل نے ان کو صحیح طرح سے دیکھا ہے کرداروں کی طبقاتی خوبیوں اور خامیوں کو نہیں بلکہ انفرادی خامیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ احتشام حسین نے جواب میں فرمایا " اصل بات یہ ہے کہ کچھ دن پہلے تک نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے ادب میں ٹائپ پیش کرنے کا رواج تھا۔ ایک TYPICAL کردار کے ذریعہ ایک حد تک ہی سچائی کی عکاسی ہو سکتی ہے۔ مکمل طور پر نہیں اس لیے ہمیں فرد کو فرد کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے۔ مثلاً پریم چند کو لیجیے وہ کردار کو شروع میں ایک فرد کی حیثیت سے ہی پیش کرتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھتے بڑھتے وہ کردار عینیت پسندی کے زیر اثر آجاتا ہے۔ لیکن فرد پر زیادہ زور اس زمانے میں ممکن بھی نہ تھا۔ فرد اور شخصی آزادی پر آج جتنا زور دیا جا رہا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں دیا تھا اس لیے یہ تبدیلی فطری ہے۔ قاضی عبدالستار کا اگلا سوال تھا: " تو فرد کی نمائندگی ترقی پسندی کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ احتشام حسین کا جواب تھا " ترقی پسندی پر یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے۔ ہمیں آدمی کی کھوج ایک آدمی کی حیثیت سے بھی کرنا ہے۔ محض طبقہ کے فرد کی حیثیت سے نہیں۔ رالف فاکس نے اپنی مشہور کتاب (NOVEL AND THE PEOPLE) میں ناول کو فرد کی کہانی قرار دیا ہے۔ (TYPE) کی کہانی نہیں"[1] احتشام حسین نے فرد کی نمائندگی کو ترقی پسندی کے خلاف نہیں سمجھا۔ وہ افسانوں میں اختصار کی طرف خصوصیت سے توجہ دیتے تھے۔ "میں نے تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی بات کو کم سے کم جگہ میں کہنے کی کوشش کی ہے"[2]

---

[1] احتشام حسین سے ایک انٹرویو۔ رام لعل قاضی عبدالستار۔ عابد سہیل۔ کتاب اگست ۱۹۶۵ء
[2] ویرانے۔ احتشام حسین ص

دوسری جگہ لکھا کہ "میں نے صرف اتنی باتیں کہی ہیں جتنی اس افسانے کے لئے ضروری ہیں[1]
اپنے افسانوں میں خارجی اور داخلی حقیقتوں کی پیش کش میں انکا نظریہ یہ تھا:۔
"میں داخلی حقیقتوں کی اصلیت کا منکر نہیں ہوں لیکن جانتا ہوں کہ داخلی حقیقتیں خارجی حقیقتوں کا بھی عکس ہوتی ہیں۔ اور کچھ نتیجہ اس لیے داخلی حقیقتوں کا اس طرح بیان کہ ان کا تعلق خارجی حقیقتوں سے نہ ہو، میرے خیال میں حقیقت نگاری نہیں ہے۔ حقیقت ایک پیچیدہ عمل ہے اسلئے اسے حصول میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ عشق و محبت معاشی اور سیاسی مسائل، عمل اور خیال سب ایک دوسرے میں گھتے ہوئے ہوتے ہیں اور میں نے اپنے بیشتر افسانوں میں اس کا خیال رکھا ہے"[2]

انھوں نے "حقیقت نگاری" کے علاوہ دلکشی کا بھی مختلف طریقوں سے التزام کیا "میں نے کہانی لکھتے وقت اس دل کشی کا خیال ضرور رکھا ہے جو کہانی کے لئے ضروری ہے۔ یہ دلکشی کبھی پلاٹ سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی انداز بیان سے اور کبھی صرف موضوع کے انتخاب سے"[3]
احتشام حسین نے افسانوں کی تنقید میں فن پر خاص توجہ دی ہے۔ انکی پریم چند، نیاز، کرشن چندر، بیدی، منٹو، شاہد، احمد ندیم، قاسمی وغیرہ کے افسانوں پر تنقید اس حقیقت کی شاہد ہے۔
پریم چند کے افسانے "بڑے گھر کی بیٹی" کی تنقید میں دلکشی دلچسپی، مقصد، زبان کی لطافت کیساتھ پلاٹ کی تعمیر کو بھی اہمیت ملی ہے۔ "وہ افسانہ پہلی بار اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ حقیقتاً کہانی میں دلکشی، دلچسپی، مقصد، زبان کی لطافت اور پلاٹ کی تعمیر ساری چیزیں کیسے ایک ساتھ جمع ہوسکتی ہیں۔"[4] یہی انداز نظر پریم چند کے افسانہ "کفن" کی تنقید میں نمایاں ہے۔
"انھوں نے اپنے آخری دنوں میں کفن کی تخلیق کی تو ان کے یہاں فکر و فن مواد اور ہیئت کا ایسا حسین امتزاج ہو چکا تھا جو عروج فن کی آخری منزل ہے"[5]

---

[1] ویرانے احتشام حسین ص ۱۱ [2] ویرانے۔ احتشام حسین ص ۱۱ [3][4] اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص ۱۳۶
[5] عکس اور آئینے۔ احتشام حسین ص ۱۰۱

ان کے لیے پریم چند کے افسانے اس لئے اہم ہیں کہ ان میں "فکر و فن" کا حسین امتزاج بھی ہے۔ نیاز کے افسانوں میں فن افسانہ کے مطالبات پورے نہیں کئے گئے ہیں اس لیے احتشام حسین ان سے مطمئن نہیں "افسانے کے مطالبات پلاٹ، کردار نگاری ڈرامائی تاثر اور ارضی فضا کے مطالبات ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزوں کی طرف سے نیاز افسانوں میں غفلت برتتے ہیں۔ فلسفیانہ مباحث، نفسیاتی موشگافیوں، قول محال اور رنگین بیانی سے ان چیزوں کی کمی پوری نہیں ہوتی"[1] کرشن چندر کے افسانوں کے تنقیدی تجزیے میں احتشام حسین نے فن افسانہ کے مطالبات کو پیش نظر رکھا ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کی تنقید سے احتشام حسین کے انداز نظر کے ان کے نظریے کے بہت سے دریچے کھل جاتے ہیں۔ افسانوں میں زندگی کی نمائندگی اور اس کا پر لطف انداز بیان ملاحظہ فرمایئے:

کرشن چندر کے افسانے زندگی کے سرجیون سوتوں سے رس چوستے ہیں اور اسکی لطافت کا اظہار ان کے اندازِ بیان، ان کے ہلکے پھلکے اشاروں اور کنایوں ان کے اظہار کی روانی، شعریت اور اثر انگیزی میں ہوتا ہے۔ یہ خوبیاں ایسی ہیں جو افسانہ نگاری کے ہر پہلو پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ آخر ایک فنکار کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے کہ اس کے مواد کی شگفتگی اس کے طرزِ اظہار میں باقی رہ جائے۔ اس کے موضوع کی گہرائی اس کے بیان میں جھلک اٹھے اس کی لکھی ہوئی کہانی کی لطافت پڑھنے والے کو ہر طرف سے گھیر لے۔ کرشن چندر کے زیادہ افسانوں میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں"[2]

افسانہ کی تکنیک اور دلکشی کے کیمیاوی عمل کا بیان دیکھیے:-

"اس وقت ہندوستانی ادب میں مختصر افسانہ ہی ہر طرح کی نفسیاتی، فلسفیانہ سیاسی اور جذباتی تحریکوں کا مظہر بن گیا ہے۔ اس کی غیر متعین تکنیک اور

---

[1] اعتبار نظر۔ احتشام حسین صفحہ ۱۱۶ [2] روایت اور بغاوت احتشام حسین صفحہ ۱۹۰-۱۹۸

لچک کے راز کو سمجھنے والا افسانہ نگار ہر قسم کے موضوع کو دلکش بنا سکتا ہے
عمومی نقطۂ نظر سے تو افسانے میں صرف دلکشی چاہیئے لیکن یہ دل کشی ایک
مستقبل اور کیمیاوی عمل کے بعد حاصل ہوتی ہے جب لکھنے والا اپنے موضوع
اور مواد کو سیال بنا کر اپنے اسلوب کے سانچے میں ڈھال لے اسوقت
افسانے میں وہ دل کشی پیدا ہوتی ہے جسے خواص اور عوام دونوں پسند کرتے
ہیں[1]"

کرشن چندر کے یہاں مضبوطی اور پائندگی، ان کے نزدیک " مادی تصور حیات " کا
نتیجہ ہے۔" زندگی بظاہر کتنی متضاد ہے۔ اس تضاد کی وجہیں ہیں۔ افراد مختلف حالات میں مختلف
بن جاتے ہیں۔ اس کی بھی وجہیں ہیں۔ لیکن افسانہ ان وجہوں کے بالکل فلسفیانہ خارجی بیان
کو اپنے اندر جگہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے افسانہ نگار کے لیے اچھی خاصی فنی دشواری کا
سامنا ہوتا ہے یا تو وہ اسباب و علل کے اس رشتہ کو ہاتھ سے چھوڑنے اور اپنے ذہین پڑھنے
والوں کو غیر آسودہ رکھے یا انھیں اس طرح بیان کرے کہ اس کے فن پر حرف نہ آئے۔۔۔۔۔
ان کی چابکدستی، ان کا فنی شعور سبب اور نتیجے کے اس تعلق کو ایک مطلق یا تجریدی شکل میں
نہیں دیکھتا بلکہ انسانی زندگی کے ہر لمحے اور بدلتے ہوئے احساس میں کردار کی نشو و نما میں اسکے
افعال کے تخلیقی جوہر میں اس تعلق کو ڈھونڈتا اور پاتا ہے۔ زندگی اور ادب کے تعلق کا یہی
مطلب ہے اور افسانے میں حقیقت کا یہی مفہوم ہے[2]" کرشن چندر کے یہاں داخلیت اور خارجیت
کے امتزاج کا بیان دیکھئے :-

"حقیقت کا احساس، خیال اور ذہن کے محشرستان سے گزرتا ہوا مرکب جذبات
میں آمیز ہوتا ہوا پھر ہر ایک سے اپنی چمک دمک کے سامان لیتا ہوا حقیقت
کی فنی شکل متعین کرتا ہے۔ خارجی مظاہر اگر شدت احساس کی اس بھٹی میں

---

[1] روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین صفحہ ۱۹۱ [2] روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین صفحہ ۱۹۲-۱۹۱

پگھلائے نہ جائیں تو اخبار کی رپورٹ بن کر رہ جائیں اور ناپائیدار خیالات کے پردوں میں اڑنے والی داخلیت اگر خارجی اور مادی زندگی سے طاقت حاصل نہ کرے تو ہمارے شعور کو تھکا دینے والی چیز بن جائے وہ داخلیت جو انسان کی مادی زندگی کا جذباتی رخ اختیار کر کے سطح پر ابھرتی ہے۔ سچ پوچھا جائے تو وہ بھی خارجی حقائق ہی کا ایک حصہ ہے اس لئے اس کا بیان واقعات کے خارجی بیان سے بے تعلق ہو کر کرنا حقیقت کے مفہوم ہی کو مجروح کر دیگا۔ کرشن چندر کے یہاں داخلیت اور خارجیت کا یہ توازن موجود ہے"[1]

کرشن چندر کے افسانوں میں مقصد اور اس کے فنی اظہار اور اعلیٰ ادب کے معیار پر نظر دیکھئے۔ کرشن چندر کے سے افسانہ نویس سے یہ امید نہیں ہو سکتی کہ وہ محض زیب داستاں کیلئے اپنے فرض سے غافل ہو جائے گا۔ اچھے فنکار کی یہی پہچان ہے کہ نہ اس کا مقصد اس کے فن کو مجروح کرتا ہے اور نہ صناعی مقصد کو دونوں کا حسین امتزاج اعلیٰ پایہ کا ادب تیار کرتا ہے"[2] اثر انگیزی کا راز دیکھئے:۔

"کرشن چندر اپنا نقطہ منظر ذہن نشین کرنے کے لئے ترغیب اور اثر انگیزی کے تمام فنی حربے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ طنز کا سب سے زیادہ بے پناہ استعمال کرتے ہیں"[3]

احتشام حسین کے نزدیک ابہام کے اسباب ہیں۔ ابہام زیادہ تر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب افسانہ نگار تکنیک پر قدرت رکھتا ہو۔ اپنے موضوع سے پوری طرح واقف نہ ہو یا شعور کے بجائے لاشعور کی کھوج میں نکل جائے"[4] اشاریت اور علامیت کے حق استقلال پر اندازِ نظر ملاحظہ کیجیے:۔

---

[1] روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین ص ۱۹۳ [2] روایت اور بغاوت احتشام حسین ص ۲۰۰
[3] " " " " ص ۲۰۲ [4] " " " " ص ۲۰۳

"کرشن چندر کے کچھ افسانوں میں گہری اشاریت اور علامیت پائی جاتی ہے یہ نقاب حقیقتوں کے اظہار کے لیے ضروری ہے یا نہیں اس کا بہت کچھ انحصار فنکار کے شعور پر ہے۔ اس کے لیے طرز اظہار اور افسانے کی معنویت میں اگر فنکارانہ ربط قائم ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا وحدت اثر کا مکمل احساس کرتا ہے تو اشاریت ابہام پیدا کرنے کی جگہ افسانے کے حسن میں اضافہ کر دیتی ہے[۱]۔"

مختصر افسانہ کے معیار اور فن کی میزان پر ایک نظریہ ہے۔ "مختصر افسانہ معیاری اور فنی نقطۂ نظر سے ایسا کوئی جملہ، کوئی لفظ کوئی خیال اپنے میں شامل نہیں کر سکتا جو بالکل ضروری نہ ہو۔ جس کے بغیر تاثر میں کسی طرح کمی رہ جائے۔ ایسی حالت میں کہانی کو پھیلا دینا اس میں مختلف تاثرات کا شامل کر دینا۔ مرکز سے ہٹ کر ضمنی باتوں میں الجھ کر رہ جانا اکثر افسانوں کے توازن کو خراب کر لیتا ہے۔ اور زیادہ تر افسانہ نگار اس سے بچتے ہیں[۲]۔" کرشن چندر کی ساحری کا راز احتشام حسین کے الفاظ میں یہ ہے:-

"کرشن چندر کے افسانوں میں تازگی اور شگفتگی، شادابی اور رعنائی ہے۔ زبان کی لطافت تشبیہوں کی جدت، اسلوب کی ندرت، موضوع اور طرز بیان کی ہم آہنگی، موضوع اور مواد کی سماجی اہمیت انسانیت کا درد اور اس کی ترقی کی امید یہ باتیں جس افسانہ نگار میں اکٹھی ہو جائیں وہی ساحری کر سکتا ہے[۳]۔"

احتشام حسین نے مختلف افسانہ نگاروں کے مقام اور مرتبہ کے تعین میں ان کی "فن افسانہ" پر گرفت کی صلاحیت کو پیش نظر رکھا۔ بیدی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے "تصویر فن کا مظاہرہ" کیا۔ منٹو کی افسانہ نویسی کی سب سے نمایاں خوبی ان کا "فنی شعور" تھا۔ "دلی کی سیتا" کے مصنف کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ شاہد کا "نقطۂ نظر فنی" نہیں تھا۔ احمد ندیم قاسمی اس لیے کامیاب افسانہ نگار ثابت ہوئے کیونکہ وہ فن کے "شعور" "موضوع کی بصیرت" اور

۱۔ روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین ص ۲۰۵ ۲۔ روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین ص ۲۰۵

۳۔ " " " ص ۲۰۷

"مواد پر قدرت" رکھتے تھے۔ احتشام حسین اردو افسانہ میں پیش ہوئے موضوعات کا ذکر کرتے ہیں اور جن افسانہ نگاروں نے انکی پیش کش میں عمر جاوداں پائی ان کی خوبیوں کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں "جن افسانہ نگاروں نے فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ ان موضوعات کو اپنایا ان میں چند اہم نام یہ ہیں.....[1] "اردو افسانہ صرف موضوع کی بنیاد پر مقبول نہیں ہوتا اس کا راز تکنیک کا تنوع بھی ہے۔" اس مختصر سی مدت میں افسانہ موضوع کی وسعت اور تکنیک کے تنوع کے اعتبار سے ادب کی سب سے زیادہ مقبول اور اہم صنف بن گیا"[2]

احتشام حسین نے اردو افسانہ کے ساتھ پورا خلوص برتا۔ انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ ان سے بہتر افسانہ لکھے جا رہے ہیں تو انھوں نے افسانہ لکھنے سے زیادہ پڑھنا مناسب سمجھا۔ جب انھیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے موضوع صنف ملی تو انھوں نے افسانے لکھ کر اپنے داغ و درد کا اظہار کیا۔ احتشام حسین کو اپنے نظریات بہت عزیز تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے نظریات کو سونپ دی۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ انھوں نے نظریہ کے ساتھ ساتھ فن کی پاکیزگی اور عظمت کا احترام بھی کیا۔ انھوں نے صرف فن کو پوری کائنات نہیں سمجھا۔ احتشام حسین نے اپنے لیے ایک راہ بہت سوچ سمجھ کر ڈھونڈلی تھی۔ یہ بات کم اہم نہیں کہ انھوں نے اس خلوص اور جذبے کے ساتھ اپنے نظریہ کو ادب میں عام کیا۔ انہیں اپنی راہ منتخب کرنے کی پوری آزادی تھی۔ انھوں نے زندگی بھر آمریت کیخلاف مورچہ لیا۔

(فروغ اردو، احتشام حسین نمبر)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

[1] عکس اور آئینے - احتشام حسین - ص ۱۰۲

[2] " " " "

مکاتیبِ احتشام

از ڈاکٹر اخلاق اثر

"ڈاکٹر اخلاق اثر کی اس تالیف سے مرحوم احتشام حسین کے خطوط کی طباعت کے کام کا آغاز ہوا ہے۔ مکاتیب احتشام میں شامل مکاتیب سے احتشام حسین کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔"

مالک رام

"اِن خطوط کے شروع میں ڈاکٹر اخلاق اثر کا تعارف بہت پُر مغز، مبصرانہ اور ناقدانہ ہے۔ اس عہد کے ادیبوں کی زندگی، سماجی اقدار اور علمی و ادبی سرگرمیوں پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے۔۔۔۔ مکاتیب احتشام ہمارے مکتوباتی ادب میں فی الحقیقت ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔"

ڈاکٹر عبد الاحد خاں خلیل

"ڈاکٹر اخلاق اثر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مرحوم کے کچھ خطوط شائع کر کے اردو مکاتیب میں ایک مفید اضافہ کیا ہے۔

عبد اللطیف اعظمی

احتشام حسین اور مدھیہ پردیش

پیغامات اور تاثرات

(آپ حضرات جو حلقۂ ارباب ادب کا سالانہ اجلاس کر رہے ہیں وہ اس بات کا جواب عیکہ ادب موجود ہے ہر عہد کے ادب میں جمود ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ اگر ادیب زندگی کے مسائل سے دست و گریباں ہیں تو جمود نہیں رہ سکتا۔ پہلے زمانے میں یہ کام انفرادی بنیاد پر مقابلہ اور مسابقت کی وجہ سے ہوتا تھا۔ آج تنظیم کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہم ادب میں ترقی پسندی کے نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتے ہیں تو ہمیں منظم ہوئے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ حضرات، ایسے حلقہ کی سالانہ مجلس کر رہے ہیں تاکہ ایک بار پھر وسیع ترین ادبی اور سماجی بنیادوں پر انسانوں کی ادبی خدمت کرنے کا عہد کریں۔ میں آپ کی کامیابی کا دل سے خواہش مند ہوں۔

——— احتشام حسین)

ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ" اردو والوں کا کوئی کام سرور اور احتشام کے بغیر نہیں چل پاتا"[۱] اور لکھا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں اصحاب کے بغیر اردو کا کوئی ادارہ اور کوئی کمیٹی مکمل نہیں ہوتی۔ وہ گجرال کمیٹی کے مختلف شہروں کے دوروں کے وقت احتشام حسین کو شدت سے یاد کرتے ہیں۔ احتشام حسین سے محبت کرنیوالوں اور عقیدت رکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ اور ان کی تحریروں میں یہ محبت اور عقیدت مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ حال ہی میں قاضی عبدالستار کی تحریروں نے احتشام حسین کی یاد تازہ کردی وہ سجاد ظہیر کو دیکھ کر لکھتے ہیں۔ "کتنے ہی بوڑھے حسین آدمیوں کا خیال آگیا۔ لیکن ان کا ذکر نہیں کر

[۱] احتشام حسین کچھ بھولی بسری یادیں۔ ڈاکٹر گیان چند۔ فروغ اردو احتشام حسین نمبر ص ۵۲

سکتا کہ ان میں سرِ فہرست تو احتشام صاحب ہیں اور احتشام صاحب کے نام کے ساتھ صیغہ ماضی کا استعمال کرتے ہوئے ہاتھ کانپنے لگتا ہے۔ ہڈیاں سرد ہونے لگتی ہیں ______ اور آنسو!۔۔۔۔۔ آنسو رکیں تو قلم چلے"[1] اور اورنگ آباد سمینار میں ان کے "سایہ" عاطفت کی محرومی سے خود کو "غیر محفوظ" سمجھتے ہیں۔

"اورنگ آباد سمینار کا تیسرا اور آخری اجلاس تھا۔ لسانی غیرت اور اپنے نصب العین کی حمیت کی سرشاری نے کبھی اس طرح بیقرار نہیں کیا تھا جس طرح میں اس سمینار میں بیقرار رہا۔ اس سے قبل کسی ایسے سمینار میں شریک نہ ہوا جس میں دوسری زبانوں کے ملنے ہوئے اہلِ قلم موجود ہوں۔ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے اجلاس میں صرف ہندی کے ادیبوں کا ہجوم تھا۔ لیکن وہاں لسانی کم ظرفی کا گزر ممکن نہ تھا کہ احتشام صاحب کی موجودگی کا سایہ ہمارے سروں پر قائم تھا۔ ان کے علم کا منارۂ نور روشن تھا کہ ان کی زبان کی تلوار بے نیام اور بے امان تھی اور ہم صرف موجود اور محفوظ ہونے پر شاکر تھے۔ لیکن اورنگ آباد میں کون تھا۔"[2] احتشام حسین یاد ہیں اور یاد رہیں گے۔ وہ ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھے جن کی اپنی زندگی میں بہت قدر و منزلت ہوئی اور ان سے فیض حاصل کرنے والوں نے ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ برصغیر میں ادب کی بڑی اور چھوٹی، اہم اور غیر اہم ادبی سرگرمیوں میں احتشام حسین سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ ان کے مشوروں پر عمل کیا جاتا تھا۔ ان کے پیغامات بالکل رسمی اور سرسری نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ان کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ زندہ قومیں اپنے مشاہیر کے ایک ایک حرف اور ایک ایک لمحہ کو محفوظ کرتی ہیں۔

حمیدیہ کالج، بھوپال کی "بزمِ ادب" کے لئے احتشام حسین کا پیغام حاصل کیا گیا تھا۔ احتشام حسین نے یہ پیغام ۲۰ اگست ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ سے تحریر فرمایا جو "بزمِ ادب" کے جلسہ میں پڑھا گیا اور یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین کے "اردو سیکشن" میں شائع ہوا اس وقت میگزین کی مدیر[3] صفیہ اختر تھیں۔ احتشام حسین نے تحریر فرمایا تھا:

---

[1] سفر ہے شرط ۔۔۔۔۔ دکن سمینار، ایک رپورتاژ، قاضی عبدالستار۔ کتاب اگست ستمبر ۱۹۷۲ء ص ۳۶

[2] سفر ہے شرط ۔۔۔۔۔ دکن سمینار، ایک رپورتاژ، قاضی عبدالستار۔ کتاب اگست ۱۹۷۲ء ص ۳۷

[3] میگزین میں نگراں کی جگہ مدیر لکھا گیا ہے۔ اور طالب علم کو نائب مدیر کی حیثیت دی گئی ہے۔

"مجھے بے حد مسرت ہے کہ حمیدیہ کالج بھوپال کی "بزم ادب" اپنے سالانہ ادبی سفر پر روانہ ہو رہی ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ جو سفر پہلے خوشگوار ہوا کرتا تھا۔ اب مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ راہ کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ ہم سفروں کی بے دلی بھی اس کا سبب بن گئی ہے۔ لیکن عملی اور ادبی کام کرنیوالوں کے جوش اور ذوق کو دیکھ کر یہ خیال مایوسی کی شکل اختیار کرنے نہیں پاتا بلکہ یقین ہوتا ہے کہ اگر کچھ لوگ بھی ہمت سے کام لیتے رہیں تو راہ کی دشواریوں پر قابو پانا مشکل نہ ہوگا۔ اگر آپ میں زبان و ادب کی خدمت کا سچا اور صحت مند جذبہ موجود ہے تو آپ یقیناً منزل تک پہنچینگے۔

طلباء کی ادبی انجمنوں کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر ہمیں اپنے مطالعہ کی سمت نہ معلوم ہو تو محض جوش اور ولولہ ناکافی ہوتا ہے اس وقت جذبات کو غلط راہوں پر ڈالنے والے بہت سے عناصر کام کر رہے ہیں۔ مذہبی تنگ نظری اور فرقہ وارانہ تعصب ہے۔ ایکدوسرے سے لاعلمی ہے۔ تہذیب کے متعلق غلط نظریات ہیں۔ زبان کے سلسلہ میں غلط فہمیاں ہیں۔ ادب اور زندگی کے تعلق کے بارے میں واضح اور متوازن نقطۂ نظر کا فقدان ہے۔ یہ ساری باتیں نوجوان طلباء کے رائے قائم کرنیکی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ ایسی حالت میں محض جوش سے کام نہیں چل سکتا۔ غور و فکر اور سنجیدہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اپنی تنقید سختی سے اور دوسروں کی تنقید ہمدردی سے کی جائے جو طلباء اس کو اپنا مطمح نظر بنائیں گے وہی سچا ادبی کام کر سکیں گے۔ یہی میرا پیام ہے[1]"

جب یہی بزم اپنی زندگی کی دسویں سال میں داخل ہوئی تو اس موقع کے لیے پیغام میں احتشام حسین نے تحریر فرمایا:۔

---

[1] گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین یکم جنوری ۱۹۵۲ء ص ۶

"اگر بزم ادب طلباء میں مطالعہ کا ذوق پیدا کر سکے تو میں اس کو اس کی سب سے بڑی کامیابی قرار دوں گا۔ کیونکہ طالبِ علم کی زندگی کا بنیادی پتھر یہی ہے۔ اس کے بغیر اس کے مضامین، بحث مباحثوں میں تقریری مقابلے، شعر و شاعری ہر ایک میں کھوکھلا پن نظر آئیگا۔ پھر ایسا بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ مطالعہ محض لت بن جائے۔ بلکہ تحقیقی و تنقیدی ہو کہ جو کچھ پڑھا جائے وہ زندگی کا جز بنے"[1]

حلقۂ اربابِ ادب ۱۹۵۲ء میں اس انجمن کی چوتھی سالانہ کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ اور اس کے فوراً بعد احتشام حسین کا ۲۰ اگست کا لکھا پیغام پڑھا گیا۔ انھوں نے تحریر فرمایا تھا:۔

"آپ حضرات جو حلقۂ ارباب ادب کا سالانہ اجلاس کر رہے ہیں وہ اس بات کا جواب ہے کہ ادب میں جمود ہے۔ ہر عہد کے ادب میں جمود ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ اگر ادیب زندگی کے مسائل سے دست و گریباں ہیں تو جمود نہیں رہ سکتا۔ پہلے زمانے میں یہ کام انفرادی بنیاد پر مقابلہ اور مسابقت کی وجہ سے ہوتا تھا۔ آج تنظیم کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم ادب میں ترقی پسندی کے نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتے ہیں تو ہمیں منظم ہوئے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ حضرات اپنے حلقہ کی سالانہ مجلس کر رہے ہیں۔ تاکہ ایک بار پھر وسیع ترین ادبی اور سماجی بنیادوں پر انسانوں کی ادبی خدمت کرنے کا عہد کریں۔ میں آپکی کامیابی کا دل سے خواہشمند ہوں"[2]

گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کی "بزمِ ادب" اور بھوپال کے "حلقۂ اربابِ ادب" کے علاوہ انھوں نے کالج کے مجلّوں کے لئے بھی پیغامات تحریر فرمائے۔ سیفیہ کالج بھوپال کے میگزین کے لئے احتشام حسین کا پیغام مندرجہ ذیل تھا:۔

"آپ اس کی فکر کیجیئے کہ زیادہ تر مضامین اور نظمیں طلباء ہی کی ہوں۔ ادھر ادھر

---

[1] مہارانی لکشمی بائی گرلس کالج میگزین بھوپال۔
[2] مکتوب احتشام حسین بنام آفاق احمد صدر شعبہ اردو مہارانی لکشمی بائی گرلس کالج بھوپال۔

سے مانگ کر چیزیں جمع کرنا تجارتی رسائل کیلئے چھوڑ دیجیے۔ اگر ایسا ہی ہے تو زیادہ تر بھوپال کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شامل کیجئے تاکہ آپ کے رسالے کی علاقائی خصوصیت بھی نمایاں رہے[1]۔"

مُلّا فخر الدین، سیکریٹری سیفیہ کالج ایجوکیشن سوسائٹی بھوپال اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی عنایت اور دلچسپی کی وجہ سے اردو کا میگزین "مجلہ سیفیہ" کے نام سے ۶۱-۱۹۶۲ء میں علیحدہ شائع ہوا۔ اس کے لیے احتشام حسین نے الہ آباد سے پیغام روانہ فرمایا جس میں تحریر تھا:۔

"یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ سیفیہ ڈگری کالج میں اردو کا رسالہ "مجلہ سیفیہ" الگ شائع ہو رہا ہے۔ اردو کی انفرادیت کا تقاضہ بھی یہی تھا اور سچ پوچھیے تو موجودہ سیاست کے اس طوفان میں جب کبھی اردو کو ہندی کا ایک روپ یا شیلی کہکر، کبھی اس کا رسم خط مٹا کر، کبھی اس پر قوم دشمن ہونے کا الزام لگا کر جو حملے کیے جاتے ہیں ان سب کا مقصد یہی ہے کہ اسے ایک غیر اہم زبان ثابت کیا جائے اور اس طرح اس کی انفرادیت کو ختم کر دیا جائے اس وقت ہمارا ...... اور ہم اردو کے نام لینے والوں کا یہ فرض ہے کہ اس کی ان خصوصیات کو نمایاں کریں جو قومی زندگی میں اس کی جگہ بناتی ہیں۔ ان عناصر کو ابھاریں جو اتحاد و اتفاق کی بنیادوں کو استوار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا قدیم ادب بھی غالباً دوسری زبانوں کے ادب سے پیچھے نہیں تھا۔ موجودہ ادب تو اس کا ایک زندہ نشان ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کا مجلّہ بھی اس کی آئینہ داری کرے اور ایسی تخلیقی اور تنقیدی چیزیں پیش کرے جو ہر طرح کی تنگ نظری سے پاک ہوں۔ میں رسالے کی کامیابی کا دل سے خواہش مند ہوں[2]۔"

"مجلّہ سیفیہ" میں ڈاکٹر گیان چند اور پروفیسر دسنوی ڈاکٹر ابو محمد سحر جیسے نامور محققین اور ناقدین کی تحریریں شائع ہوئیں اور انھوں نے "مجلہ سیفیہ" کو "علاقائی کردار" عطا کیا۔

---

[1] پروفیسر آفاق احمد۔ شاہکار (احتشام حسین نمبر) نومبر۔ دسمبر ۷۳ء ص ۱۹۵

[2] مجلّہ سیفیہ۔ جلد اول (۶۱-۱۹۶۲ء) ص ۱۲

"اردو کو بھوپال کی علاقائی زبان کی حیثیت دلانے کے لیے ۸ اگست ۱۹۵۳ء کو بھوپال اسٹیٹ اردو کنونشن منعقد ہوا تھا۔ اس موقع کے لیے بھی احتشام حسین سے پیغام کی درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے تحریر فرمایا تھا:

"اس وقت جو صورتِ حال ہے اس میں اردو کے لیے ہر جد وجہد کا خیر مقدم کرنا فرض سمجھتا ہوں اور اس کا ہر کارکن عزیز ہے۔ بھوپال میں تو ایک طویل زمانہ سے اردو کی ایک روایت...... زندہ روایت رہ چکی ہے جو فرقہ پرستی، تنگ نظری اور دلآزاری سے ہمیشہ دور رہی اگر اردو سے محبت کرنے والوں نے انھیں خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اردو کو مادری زبان ماننے والوں کے حقوق کیلئے جد وجہد کی تو مجھے یقین ہے کہ کامیابی ہوگی۔ میں اپنی بہترین تمناؤں کے ساتھ مبارکباد کا پیغام بھیجتا ہوں"[1]

احتشام حسین ادبی حلقوں میں اپنی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ انہیں بار بار زحمت سفر دی جاتی اور وہ بھی مصروفیات سے وقت نکال کر مختلف علاقوں کا سفر کرتے۔ ۲۳ نومبر ۱۹۶۴ء کو اردو لٹریری سوسائٹی، سیوا سدن کالج، برہان پور کے زیر اہتمام دو ادبی نشستیں ہوئی تھیں[2]۔ پہلی ادبی نشست میں انھوں نے اردو زبان و ادب پر تقریر فرمائی تھی اور دوسری ادبی نشست میں مشاعرہ کی صدارت بھی فرمائی تھی اور اپنا کلام بھی سنایا تھا۔[3] انھوں نے پہلے ادبی جلسہ کے بارے میں تاثرات قلم بند کیے۔ تحریر فرمایا:

"اردو لٹریری سوسائٹی سیوا سدن کالج برہان پور کے کارکنوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ارباب کالج، اساتذہ اور شہر کے سربرآوردہ حضرات کے تعاون سے ۲۳ نومبر کو ایک کامیاب جلسہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مختلف سیاسی اور مذہبی خیالات رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے

---

[1] رپورٹ بھوپال اسٹیٹ اردو کنونشن منعقدہ ۸ اگست ۱۹۵۳ء ص ۲۳ عنایت کردہ اظہر راہی صدر شعبۂ اردو وکرم یونیورسٹی، اجین۔ [2] سرجن سیوا سدن کالج برہان پور کا سالانہ ۶۵-۱۹۶۴ء ص ۲۳: عنایت کردہ مولوی معین الدین صاحب برہانپور؛ [3] بیان جناب اقبال نعیب صاحب دبرہانپور)

والے سب نے مل کر اس جلسہ کو کامیاب کیا۔ اس میں جہاں اردو زبان کی ہر دلعزیزی کو دخل ہے وہیں کارکنوں کی انتھک کوششوں کا ہاتھ بھی ہے۔

مجھے سوسائٹی کے کارکنوں سے صرف یہ کہنا ہے کہ اگر ہم دوسری زبانیں بولنے والوں کو اردو کی مٹھاس، ترقی پسندی اور اتحاد دوستی کا یقین دلا سکیں تو ہمیں اس سے زیادہ کامیابی ہوگی۔ جتنی اردو کے لئے نالہ و فریاد کرنے سے ہوسکتی ہے بدلے ہوئے حالات میں اردو کو زندہ رکھنے کا طریق کار بھی بدل جانا چاہیے۔ آپ کو اپنے گرد و پیش کی مختلف زبانوں سے دلچسپی لینا چاہیے تاکہ دوسرے آپکی زبان سے دلچسپی لیں[1]"

برہانپور میں قیام کے دوران احتشام حسین صاحب جنتا لائبریری بھی تشریف لے گئے اور اپنے تاثرات قلمبند کیے تھے:

"مجھے آج جنتا لائبریری برہانپور کے دیکھنے کا موقع ملا، مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ کسی سرمایہ دار کی سرپرستی اور حکومت کی قابل ذکر امداد کے بغیر یہ لائبریری یہاں کے ہندی اردو پڑھنے والوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کر رہی ہے اور بڑی خوش سلیقگی سے شائقین علم کی پیاس بجھا رہی ہے۔ میری تمنا ہے کہ یہ لائبریری اور ترقی کرے اور نہ صرف برہانپور کی قدیم علمی روایات کو تابندہ کرے بلکہ موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کی اہل بھی ہوسکے[2]"

بھوپال میں قیام کے دوران احتشام حسین ۳ / اکتوبر ۱۹۵۰ء کو اقبال لائبریری تشریف لے گئے تھے اور دل کو چھونے والے تاثرات تحریر فرمائے تھے:

"مجھے مسرت ہے کہ اقبال لائبریری کے دیکھنے اور اس کے مخلص کارکنوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ایسی لائبریریاں میرے لیے ایک تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتی ہے جن سے قوم کے شعور کا افق روشن ہوتا ہے اور مطالعہ کا شوق زندگی کے نہاں

---

[1] سرجن سواسدن کالج برہانپور کا سالانہ رسالہ ۶۵-۱۹۶۴ء ص ۵

[2] عنایت کردہ حاجی صلاح الدین صاحب (برہانپور)

خانے میں جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کتب خانہ زیادہ سے زیادہ عوام کی خدمت کرے گا اور ایسی ترقی کریگا کہ بھوپال کا دل بن جائے دھڑکتا ہوا دل۔"[1]

احتشام حسین، اقبال لائبریری، بھوپال دیکھنے کے تقریباً دس سال بعد نیشنل اردو پرائمری اسکول، چھاؤنی، منگلوارہ، بھوپال تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کو تحریر فرمایا:

"مجھے آج نیشنل اردو پرائمری اسکول آکر بے حد مسرت ہوئی کہنے کے لیے یہ مختصر اسکول ہے لیکن کام کی ابتدا ہمیشہ اسی طرح ہوتی ہے۔ جذبہ، لگن اور کام کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیزیں مجھے یہاں نظر آئیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں دوبارہ آؤں گا تو اس اسکول کے درجات میں ترقی ہو چکی ہوگی اور یہ مرکز بن کر دوسرے علاقوں کے لیے شمع ہدایت بنے گا۔"[2]

احتشام حسین کے پیغامات اور تاثرات بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ ہم ادب کو شخصیت کا اظہار کہیں یا ہم ادب میں شخصیت سے فرار کے نظریہ کو اپنائیں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ادب میں شخصیت کے اظہار اور شخصیت سے فرار کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں تک احتشام حسین کے پیغامات اور تاثرات کا تعلق ہے ان میں احتشام حسین کی شخصیت اور ان کے تصورات کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ اور ان کی شخصیت اور تصورات کے سمجھنے میں یہ پیغامات اور تاثرات بہت مدد کرتے ہیں۔

۲۰ اگست ۱۹۵۱ء کو احتشام حسین اردو کے ناسازگار ماحول سے متفکر تھے۔ ان کے نزدیک اس زمانے میں ادبی سفر جو پہلے "خوشگوار" تھا۔ اسوقت "مشکل" ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ "راہ کی دشواریاں" اور اردو دوستوں کی "بے دلی تھی۔" ۲۰ اگست ۵۴ء کو وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ "ادب میں جمود ہے" اور "اگر ادیب زندگی کے مسائل سے دست و گریباں ہیں تو جمود نہیں رہ سکتا۔ ان کے نزدیک یہ کام پہلے "انفرادی بنیاد" پر ہوتا تھا اور "آج تنظیم" کی بنیاد پر۔ وہ انسانوں کی ادبی خدمت "وسیع ترین ادبی

---

[1] عنایت کردہ جناب محمد عمر انصاری صاحب، بھوپال

[2] رہنمائی پروفیسر قاسم نیازی، صدر شعبہ فارسی، حمیدیہ کالج، بھوپال

اور سماجی بنیادوں" پر چاہتے تھے۔ احتشام حسین اردو کی قومی زندگی میں اہمیت اور قومی یک جہتی کی خصوصیات کو نمایاں کرنا اپنے اور دوسروں کے لیے " فرض " سمجھتے تھے۔ اور ہر قسم کی تنگ نظری سے دوری پسند کرتے تھے۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۶۴ء کو احتشام حسین اردو کے ناسازگار ماحول سے بے خبر نہیں تھے۔ انھیں سیوا سدن کالج برہانپور کے طلباء، اساتذہ اور اردو دوستوں کا طریقہ کار پسند آیا۔ انھیں خوشی ہوئی کہ " مختلف سیاسی اور مذہبی خیالات رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے سب نے مل کر اس جلسہ کو کامیاب کیا۔ وہ اس کامیابی کو اردو کی " ہر دلعزیزی " اور کارکنوں کی انتھک محنت " کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر اردو سوسائٹی کے کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ دوسری زبانوں کے بولنے والوں کو " اردو کی مٹھاس، ترقی پسندی اور اتحاد دوستی کا یقین " دلائیں۔ ان کے نزدیک " نالہ و فریاد " کرنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ اردو دوستوں کو مشورہ دے رہے تھے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسری زبان بولنے والے اردو میں دلچسپی لیں تو آپ کو مختلف زبانوں سے دلچسپی لینا چاہیئے۔ وہ " بدلے ہوئے حالات میں " بدلے ہوئے طریقہ کار کا مشورہ بھی دے رہے تھے۔

احتشام حسین یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کو نیشنل اردو پرائمری اسکول تشریف لے گئے تو اس " مختصر اسکول " کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ کام کی ابتداء ہمیشہ اسی طرح ہوتی ہے جس میں کام کرنے والوں کے جذبہ اور لگن سے ترقی ہوتی ہے اور بعد میں یہ کوششیں " دوسرے علاقوں کے لیے شمع ہدایت " بنتی ہیں۔ " اردو کنونشن " اور دوسری قسم کی جد و جہد میں کامیابی کے لیے وہ فرقہ پرستی، تنگ نظری اور دلآزادی سے دور رہنا ضروری سمجھتے تھے۔ پبلک لائبریری کی اہمیت سے احتشام حسین واقف تھے۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو اقبال لائبریری بھوپال کو دیکھ کر انھوں نے لکھا کہ " ایسی لائبریریاں میرے لیے ایک تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے قوم کے تصور کا افق روشن ہوتا ہے اور مطالعہ کا شوق زندگی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔" ۲۳ر نومبر ۱۹۶۴ء کو انھوں نے برہانپور کی جنتا لائبریری دیکھی جہاں اردو ہندی کی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ انھیں خوشی تھی کہ وہ لائبریری " ہندی اردو پڑھنے والوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کر رہی " تھی۔ احتشام حسین چاہتے تھے کہ کتب خانہ عوام کی زیادہ سے زیادہ

خدمت کرے۔ اقبال لائبریری بھوپال دیکھ کر انھوں نے یقین کا اظہار کیا تھا کہ کتب خانہ عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے گا اور "بھوپال کا "دل بن جائے گا ــــــ "دھڑکتا ہوا دل"۔

کالجوں کی بزم ادب یا ادبی انجمنوں کے بارے میں بھی احتشام حسین نے اظہارِ خیال فرمایا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ طلباء میں "جوش ولولہ" کے علاوہ "مطالعہ کی سمت" کا تصور بھی ہونا چاہیئے۔ "غلط راہوں" پر چلنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ "مذہبی تنگ نظری"، "فرقہ وارانہ تعصب" "تہذیب کے متعلق غلط نظریات" اور "زبان" کے متعلق غلط فہمیوں" سے دور رہنا چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ "متوازن نقطۂ نظر" کی کمی ہے اس لیے احتشام حسین نے طلباء کو مشورہ دیا کہ انھیں اپنے مطالعہ کی ان "رکاوٹوں" کو دور کرنا چاہیئے۔ وہ ادبی انجمن کے ممبران میں ادبی سرگرمیوں کے لئے "محض جوش" کو ناکافی اور "غور و فکر اور سنجیدہ مطالعہ" کو ضروری سمجھتے تھے۔ ادبی انجمنوں میں تنقید کے معیار اور ماحول کے بارہ میں ان کا خیال تھا کہ "اپنی تنقید سختی سے اور دوسروں کی تنقید ہمدردی سے کی جائے" "ادبی کام" کے لئے یہی ان کا مشورہ تھا۔

احتشام حسین کا خیال تھا کہ بزم ادب کا سب سے بڑا کام طلباء میں "مطالعہ کا ذوق" پیدا کرنا تھا۔ کیونکہ وہ اسے طلباء کی زندگی کا "بنیادی پتھر" سمجھتے تھے جس کے بغیر "مضامین، بحث مباحثوں میں تقریری مقابلے، شعر و شاعری ہر ایک میں کھوکھلا پن" نظر آتا ہے۔ وہ مطالعہ کو "محض نشہ" بنا دینا کافی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مطالعہ "تحقیقی و تنقیدی ہو کہ جو کچھ پڑھا جائے وہ زندگی کا جزو بنے"

کالجوں کے مجلّوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان میں طلباء کی تخلیقات ہی شائع ہونا چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ مقامی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے رسالوں کی "علاقائی خصوصیت" نمایاں کرنا انھیں گوارہ تھا۔ وہ دوسری جگہوں سے حاصل کی ہوئی تخلیقات کو کالجوں کے مجلّوں کے لئے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کالجوں سے شائع ہونیوالے اردو کے علیحدہ مجلّوں کو بھی پسند کرتے تھے اور اسے "اردو کی انفرادیت کا تقاضہ" سمجھتے تھے۔

احتشام حسین نے مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں میں بہت سے پیغامات ارسال فرمائے تھے۔ ان میں سے کچھ حاصل ہو سکے ہیں اور باقی کی تلاش جاری ہے۔ ان کے مطالعہ سے احتشام حسین کے

احتشام حسین کی چند تقریریں

احتشام حسین اُردو کے بلند پایہ ادیب، نقاد اور محقق تھے۔ ان کی تحریریں جہاں فکر انگیز ہوا کرتی تھیں وہاں ان کی تقریریں ان کے وسیع مطالعہ کی آئینہ دار ہوا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے ادیب اور دانشوران کی تقریروں کے نوٹس لینے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی تقریروں کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی بھی موضوع پر تقریر کرنے کی ان میں صلاحیت اور مہارت تھی۔ تقریر سے قبل زیر بحث موضوع ان کی تقریر کا موضوع بن جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر گیان چند نے حمیدیہ کالج بھوپال کی بزم ادب میں احتشام حسین کی تقریر کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ "حمیدیہ کالج بھوپال میں ایک بار ان کے اعزاز میں بزم ادب کا جلسہ کیا گیا۔ جلسے کے باضابطہ آغاز کے قبل میں ان کے پاس کرسی پر بیٹھا کہہ رہا تھا کہ "آج کے دور میں کئی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ سائنس اور دوسرے علوم کی جو افادیت ہے وہ ادب کی نہیں۔ آج کے سماج کو ادیب بہت کم متاثر کر پاتے ہیں۔ جلسہ شروع ہونے پر انھیں ڈائس پر بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے سامعین سے کہا کہ آپ جو موضوع تجویز کریں اسی پر کچھ بولوں۔ طلباء نے مختلف موضوعات کی فرمائش کی۔ مختلف فرمائشوں کے بیچ انتخاب مشکل تھا۔ احتشام صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ جلسے کے قبل کی میری گفتگو کو موضوع سخن بنایا۔ اور موجودہ دور میں ادب کی افادیت پر ایک پر مغز تقریر کر دی۔ شاعروں اور موسیقاروں کو تو فرمائشوں کی تعمیل کرتے دیکھا گیا ہے لیکن ادبی تقریر کے لئے فرمائشی موضوع پر بولتے انھیں کو سُنا اور کتنی اچھی تقریر تھی۔ وہ اُردو کے تمام اساتذہ میں بہترین مقرر تھے۔"[1] قاضی عبدالستار نے احتشام حسین کی ہندوستان اکاڈمی، الٰہ آباد کے

---

[1] احتشام حسین صاحب۔ کچھ منتشر یادیں۔ ڈاکٹر گیان چند: نیا دور۔ احتشام حسین نمبر مئی جون ۱۹۷۲ء ص ۳۵۴۔

اجلاس میں تقریر کے بارے میں تحریر فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کسی قسم کا احساس کمتری ممکن نہیں تھا۔ بقول ان کے " وہاں لسانی کمتری کا گذر ممکن نہ تھا کہ احتشام صاحب کی موجودگی کا سایہ ہمارے سروں پر قائم تھا۔ ان کے علم کا منارۂ نور روشن تھا۔ ان کی زبان کی تلوار بے نیام اور بے امان تھی۔ اور ہم صرف موجود اور محظوظ ہونے پر شاکر تھے"[۱] آفاق احمد نے جب پہلی بار احتشام حسین کو دیکھا اور ان کی تقریر سنی تو ان کا تاثر تھا کہ " کتنا ربط اور بات کہنے کا سلیقہ تھا ان میں۔ اس کا احساس اسوقت ہوا جب ایوان صدر منزل کے ایک گوشہ میں بیٹھا ان کی تقریر میں کھویا ہوا تھا۔"[۲] ادیب و صحافی جناب شرفی عثمانی کا تاثر تھا کہ پہلی بار احتشام صاحب کی تقریر سنی۔ تقریر نہایت پر مغز، مدلل اور اثر انگیز تھی۔ دلنشیں انداز اور معقول دلائل، ٹھوس حقائق اور وسیع مطالعہ کا بہترین نمونہ۔ احتشام صاحب کے بارے میں جو تصور رکھا تھا، حقیقت میں اس کے بہت آگے پایا۔ مختار شمیم نے ان کی تقریر میں سلجھے ہوئے انداز کی نشاندہی کی۔ بقول ان کے احتشام صاحب نے لسانیات کے موضوع پر بڑے سلجھے ہوئے انداز سے تقریر کی تھی۔"[۳]

حیدر عباس رضوی کا بیان ہے کہ یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کو" احتشام حسین بزم ادب حمیدیہ کالج بھوپال کے افتتاح کے لئے تشریف لائے تھے اراکین بزم ادب کے ساتھ ان کا فوٹو گروپ ہوا۔ اس عرصہ میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر گوپال ویاس نے اردو ہندی کے باہمی رشتہ پر گفتگو کرتے ہوئے احتشام صاحب سے کہا تھا کہ اردو علیحدہ زبان نہیں بلکہ ہندی کی ایک سٹیل ہے احتشام صاحب نے کہا کہ یہ ہندی والوں کی رائے ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ ڈاکٹر گوپال دیاس نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے وہ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ہم لوگ بھی تھے۔ جلسہ کا آغاز ہوا۔ رسمی تعارف کے بعد جب احتشام صاحب سے افتتاحیہ خطبہ کی درخواست کی گئی۔ تو انھوں نے ڈاکٹر گوپال ویاس کے اس خیال کو مرکز بنا کر اردو اور ہندی کے لسانی رشتہ کی وضاحت کی اور دونوں زبانوں کے ادبی ارتقاء کا تقابلی جائزہ پیش کر کے دلائل سے اس بات کو ثابت کر دیا اردو اور ہندی دونوں ایک ہی اصل کی نکلی ہوئی زبانیں ہیں۔

---

[۱] سفر ہے شرط۔ دو دن سمینار۔ ایک۔ رپورتاژ قاضی عبدالستار اگست ستمبر ۱۹۷۳ء ص ۱۹۲

[۲] روشنی گھٹ گئی۔ آفاق احمد شاہکار احتشام حسین نمبر، نومبر دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۱۹۲

[۳] ذکر احتشام مختار شمیم۔ تشکیل بھوپال جون ۱۹۷۴ء ص ۱۲

پروفیسر احتشام حسین نے اس تقریر میں مختلف مسائل پر اظہارِ خیال فرمایا تھا تقریر کا خلاصہ یہ ہے:۔

"اگرچہ اردو کی راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل روشن ہے اگر اردو کے ماضی سے ہم کچھ سیکھ سکتے ہیں تو یہی ہے کہ اس نے سیکولرازم کو تقویت پہونچائی۔ ہم اپنی اس روایت کو چھوڑنے کو تیار نہیں اردو نے محض ایک زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ تہذیبی ورثہ کی حیثیت سے کیا کچھ نہیں دیا ہمارا فرض ہے کہ ہم اردو کی ان روایات کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کریں جو ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب کا ہر عکس اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ سیاسی طور پر آج جو کام قومی یکجہتی کے نام پر ہو رہا ہے وہ ہم اردو والے بہت پہلے سے کرتے چلے آرہے ہیں ہم ایک ایسی جمہوری کی تعمیر میں شریک ہیں جس میں مشترک تہذیب کا بول بالا ہوگا۔"

پروفیسر احتشام حسین نے اردو کی ابتدائی تعمیر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات غلط ہے کہ اردو درباروں سے خانقاہوں اور خانقاہوں سے بازاروں میں آئی۔" آپ نے کہا کہ اردو نے جب اس وسیع دنیا میں جنم لیا تو اس کی پہلی منزل سماجی رہی ہوگی دوسری خانقاہوں اور پھر وہ درباروں میں گئی ہوگی اس طرح اردو بازاروں سے خانقاہوں اور خانقاہوں سے درباروں میں پہونچی۔ بہرحال اسے تاج کے سایہ میں جتنی ترقی کرنا تھی کرلی[1] اب اسے خود اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنا ہے۔"

پروفیسر احتشام حسین نے اپنی تقریر کے اختتام پر اپیل کی کہ اردو (کو) جاعتی زندگی کا ترجمان نہ بنانا چاہیئے اور مایوسی وسہل پسندی کو کفر سمجھنا چاہیئے۔ آپ نے اس کی شکایت کی کہ وزیراعظم ہند بار بار کہتے ہیں کہ اردو کو اس کا حق ملنا چاہیئے۔ اردو کو دستوری زبان بھی مانا گیا ہے۔

---

[1] تاج بھوپالی کا بیان ہے کہ جب وہ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو اس وقت احتشام حسین فرما رہے تھے " اردو تاج کی زبان تھی " تاج بھوپالی کو داخل ہوتے دیکھ کر حاضرین ہنس پڑے۔ احتشام حسین نے فرمایا " اردو تاج کی زبان ہے "۔

مگر اس کا کیا علاج ہے کہ دستوری حیثیت سے تہذیبی حیثیت یا قانونی حیثیت سے عملاً اردو کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جاتا جو اس کا حق ہے۔[1]

احتشام حسین ۲۶ ستمبر ۱۹۶۴ء کو بھوپال تشریف لائے تھے[2]

انھوں نے اس دورے میں دو تقریریں کالجوں میں کی تھیں ایک حمیدیہ کالج میں اور دوسری سیفیہ کالج میں حمیدیہ کالج کی بزم ادب کا افتتاح کرتے ہوئے احتشام حسین نے "۶۰ء کے بعد سے اردو ادب میں جدید رجحانات" پر تقریر کی تھی۔ ان کی تقریر فضل تابش نے قلمبند کی تھی اور "ادب میں علامتوں کا استعمال" کے عنوان سے حمیدیہ کالج میگزین میں شائع ہوئی تھی۔[3]

"ادب میں علامتوں کا استعمال ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہیں جب یہی علامتیں ذاتی بنتی ہیں تو دشواری ہوتی ہے ان کے معنی مفہوم اور ان کا استعمال سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے اس طرح یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ علامتوں تک قاری کے ذہن کی رسائی نہیں ہو پاتی اور قاری وادیب کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا ہے کبھی کبھی ربط بالکل ختم ہو جاتا ہے بدقسمتی سے ادھر کچھ برسوں سے یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ شاعری انفرادی چیز ہے اس جذبہ کی بنا پر پیچیدہ علامتیں بنیں ایسی علامتیں جن تک قاری کی رسائی ممکن نہیں اور اگر ہو بھی تو بات دھندلی سی ہے ایکبار میراجی نے بتایا کہ حلقۂ ارباب ذوق میں جب وہ نظمیں پیش کرتے اور ان کے بارے میں ہر سننے والے سے اظہار خیال کرایا جاتا تو ہر ایک اپنی اپنی سمجھ کے مطابق الگ الگ مطلب بتاتا اور پھر میراجی بعد میں ان سب سے علیحدہ نیا مطلب بتلاتے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی کم علمی یا مشاہداتی کمزوری کی بنا پر شاعر کے دل میں نہ پہونچ سکیں۔ ہو سکتا ہے

---

[1] بزم ادب حمیدیہ کالج میگزین مارچ ۱۹۶۳ء جلد ۱۷ شمارہ ۱ ص ۳

[2] حمیدیہ کالج میگزین جلد ۱۹ شمارہ ۲ - ۶۵-۱۹۶۴ء ص ۲

[3] حمیدیہ کالج میگزین جلد ۱۹ شمارہ ۲ - ۶۵-۱۹۶۴ء ص ۲

کہ اس کا تجربہ عجیب ہو کہیں اگر وہ خیال زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے تو اسے
ایسی علامتوں کے ذریعہ بیان کیا جانا چاہیئے کہ قاری کی سمجھ میں آسکے لیکن
محض اسلئے کہ شاعری کو انفرادی جذبہ اور ذاتی تصور کی ترجمانی کا ذریعہ سمجھ
لیا گیا ہے اس تجربہ کو ایسی علامتوں میں بیان کیا جائے جو ذاتی ہوں یہ درست نہیں ہے۔
بڑے بڑے شاعروں نے انوکھے جذبات پیش کئے ہیں جن کو عام طور پر
محسوس نہیں کیا جاتا لیکن ہم انھیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ چیزیں
سمجھ میں آجاتی ہیں۔

کسی بھی تخلیق کو ہم نفسیات، لغات اور تجربات کی روشنی
میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس کیلئے ہمیں موجودہ شاعروں کو سمجھنے
کی بھی کوشش کرنا چاہیئے اس کوشش کے بعد بھی اگر ہم ناکام ہوں تو ہم
یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تخلیق غلط ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علامت پسندوں
سے کچھ کوتاہی ہوئی ہو اگر یہ بات ہے اور وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے
تو یقیناً ہم لوگ انھیں زیادہ سے زیادہ پڑھ کر ان کے مزاج کو سمجھ سکتے
ہیں لیکن اس طرح بھی ہمیں ناکامی ہو تو پھر یہ شاعر کی خرابی ہے قاری کی نہیں

اس سلسلہ میں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ ہر لفظ کے
استعمال میں تین قسم کے معنی و مطلب ہوتے ہیں اول ہر لفظ کا لغوی
مطلب ہوتا ہے دوسرے (Associational value)
جسے ہم جذباتی مفہوم یا جذباتی قدر کہتے ہیں یہ چیز کسی مخصوص لفظ کے
کسی مخصوص مفہوم یا روایت سے ربط کی بناء پر پیدا ہوتی ہے جیسے
اقبال کی خودی۔ تیسری قدر اس لفظ کی صوتی قیمت ہوتی ہے۔ یہ چیز
بہت سے لوگوں کیلئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن اچھے شاعر
اس کی اہمیت اور خصوصیت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے
ہیں یہ خصوصیات کبھی تنہا اور کبھی سب کی سب بہ یک وقت جمع ہو جاتی ہیں۔

اور وہیں عظیم ادب پیدا ہوتا ہے۔

آخر اس بات کی وجہ کیا ہے کہ ہم موجودہ شعراء کا کلام نہیں سمجھ پا رہے ہیں جبکہ ہم لوگ ملٹن، شیکسپیئر، حافظ غالب، تلسی داس اور عرفی کا کلام سمجھ لیتے ہیں آخر اس نسل کے کلام میں ابہام کیوں ہے اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ جس لفظ کے جذبہ کا اظہار کرنا چاہتے ہیں ہم پرانی نسل کے لوگ ہیں اس طرح تو ہر نئی نسل کا سرمایہ پچھلی نسل کے سمجھ میں نہیں آئے گا اور ہر پچھلا سرمایہ نئی نسل کیلئے بیکار اور لغو ہوگا۔ ہر ادیب کا فرض ہے کہ وہ پڑھنے والوں اور سمجھنے والوں کا لحاظ رکھے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اس کے بعد فیصلہ کریں کہ واقعی وہ مبہم ہے یا نہیں۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ جو لوگ کاوش کرتے ہیں وہ موہن جو داڑو اور ہڑپہ کی تحریریں سمجھ جاتے ہیں کیا پہلے پہلے ان کی اہمیت محض لکیروں کی طرح نہ تھی۔

بہر حال اس سلسلہ میں ایک بات بہت اہم ہے تجربے ہر زمانے میں کئے گئے ہیں اور ہر زمانے میں لاکھوں شاعر اور ادیب رہے ہوں گے مگر جو ادیب و شاعر زندہ رہا وہ صرف وہی ہے جو ہماری سمجھ میں آیا ہمارے پاس ہزارہا سال کے سرمایہ میں کتنے کم لوگ ہیں اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ لاکھوں میں سے ہزاروں ہم تک آئے۔ فنون لطیفہ کی یہی تعریف ہے کہ صرف وہی چیز زندہ رہتی ہے جو جتنے عرصے تک لوگوں کے سمجھ میں آتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر جین یہاں تشریف رکھتے ہیں انھوں نے دکنی زبان پر کافی تحقیق کی ہے وہ جانتے ہیں کہ ہمارے اور اس زبان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے

لہ یہ جملہ بے ترتیب ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابت میں ایک لکیر چھوٹ گئی ہے اس جملہ کا مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ نئے دیبتوں کا خیال ہے کہ جس لفظ سے جذبہ کا اظہار کیا جاتا ہے وہ پرانی نسل کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔

لیکن ادبی ارتقاء کے سفر میں دونوں یکساں سماجی اور سیاسی حالات کے باوجود مختلف ادب کی صورتیں اختیار کر گئی ہیں۔ ڈاکٹر گوپال ویاس نے ان کی تقریر کے بعد جلسہ میں فرمایا کہ "زبان کے مسئلہ پر احتشام حسین کے خیالات بہت سلجھے ہوئے اور صاف ہیں اگر ان پر عمل کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس مسئلہ پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہوں[1]" احتشام حسین اپنی پر مغز تقریروں، سلجھے ہوئے انداز بیان اور ربط تسلسل کے لئے مشہور ہیں۔

احتشام حسین نے مدھیہ پردیش کے مختلف شہروں کا سفر کیا درجنوں تقریریں کیں۔ ان تقریروں کی تاریخ، موضوع اور مقام کے بارے میں بہت سی باتیں ابھی تاریک گوشہ میں ہیں۔ کہیں کہیں ان کی تقریروں کے سلسلہ میں صرف چند سطریں چند جملے اور چند الفاظ پڑھنے کو ملتے ہیں۔ پروفیسر آفاق احمد نے ۱۹۵۷ء میں صدر منزل میں ان کی تقریر کا ذکر کیا ہے اس وقت وہ فرما رہے تھے کہ:۔

"اردو کی ترقی کو روک دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ صدیوں کے تہذیب و تمدن کے ارتقائی دھارے کو روک دیا جائے[2]"

مختار شمیم ایک تقریر کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"مجھے ان کی تقریر کا یہ حصہ آج بھی یاد ہے۔ ادب کا مطالعہ سائنس کے مطالعہ سے کم جان لیوا نہیں ہے سائنس کا تجربہ مادی طور پر ممکن ہے مگر ادب کو پرکھنے کا پیمانہ ہمارا ذوق، علم عروض، روایت الفاظ اور ان کے استعمال کا علم ہے انھیں پیمانوں کے ذریعے ہم اسے پرکھنے کے قابل ہو سکیں گے[3]"

---

[1] حمیدیہ کالج میگزین (۶۸-۱۹۶۷ء) جلد ۲۲ شمارہ ۱ ص ۴

[2] روشنی گھٹ گئی۔ پروفیسر آفاق احمد۔ شاہکار (احتشام حسین نمبر) نومبر دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۱۰۳

[3] ذکرِ احتشام۔ مختار شمیم تشکیل بھوپال۔ جون ۱۹۷۴ء ص ۱۲

یہ الفاظ اس تقریر کا حصہ ہیں جو انھوں نے ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء
کو "۶۰ء کے بعد اردو ادب میں جدید رجحانات" پر حمیدیہ کالج بزمِ ادب کا افتتاح
کرتے ہوئے کی تھی اور اس تقریر کو "ادب میں علامتوں کا استعمال" کے عنوان
سے شائع کیا گیا تھا۔

سیوا سدن کالج برہان پور کی اردو لٹریری سوسائٹی کی
سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۶۴ء کو اردو لٹریری
سوسائٹی کے زیرِ اہتمام دو ادبی نشستوں کا انتظام کیا گیا جن میں اردو
زبان کے مایہ ناز ادیب و نقاد پروفیسر احتشام حسین صاحب نے شرکت کی۔
پہلی نشست میں آپ نے اردو زبان و ادب پر ایک بصیرت افروز تقریر کی
اور دوسری نشست میں مشاعرہ کی صدارت فرمائی۔[۱]

احتشام حسین کی چار تقریروں کے مواد کے بارے میں زیادہ
تفصیلات ملتی ہیں اس مقالہ میں اس وقت ان کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔

احتشام حسین کی ایک تقریر کا خلاصہ حمیدیہ کالج میگزین
مارچ ۱۹۶۳ء کو شائع ہوا تھا اس وقت ڈاکٹر گیان چند اس میگزین کے
نگراں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریر ستمبر یا اکتوبر ۱۹۶۲ء کو بھوپال
میں کی گئی تھی اس کا ثبوت یہ ہے کہ الٰہ آباد سے احتشام حسین نے پروفیسر
آفاق احمد کو ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو خط تحریر کیا تھا۔ لکھا تھا:-

"۱۵ کو یونیورسٹی کھلی تو چلا آیا۔ بھوپال سے واپسی کے بعد
سے برابر کوئی نہ کوئی تکلیف رہی۔ چنانچہ لکھنؤ میں دو ہفتے آرام کیلئے
گیا تھا، وہ بھی مفید نہ ہوا۔ اس وقت بہتر ہوں۔"

"میں نے بھوپال میں جو تقریر کی تھی وہ اب یاد کہاں چند ضروری
باتیں اخباروں میں آ گئی ہیں وہ ٹھیک ہیں میرا جی لکھنے میں بالکل نہیں لگ رہا
ہے ورنہ کچھ گھٹا بڑھا دیتا۔"[۲]

۱۔ سرچ سیوا سدن کالج برہانپور۔ میگزین ۶۵-۱۹۶۴ء
۲۔ مکتوب احتشام حسین بنام پروفیسر آفاق احمد بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۲ء

مگر انھوں نے مسلسل کوشش کے بعد اس دوری کو کم کر دیا ہے اور
اب وہ زبان سمجھ میں آ رہی ہے اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ ہم نئی شاعری
سے بالکل مایوس ہو جائیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں مایوس ہونے
کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہاں میں اس لئے شعراء سے ضرور کہوں گا کہ
ان کے کلام کی رسائی زیادہ دور تک ہونا چاہیئے قاری اور ان کے درمیان
فاصلہ بڑھنے کے بجائے کم ہونا چاہیئے۔

البتہ ادب میں اگر مختلف قدریں وجود میں آتی ہیں تو
میں یہ نہیں کہتا کہ ہم ان سے رشتہ توڑ لیں اور صرف انھیں کو اپنا لیں
جو دائمی ہوں میں اس بات کا منکر نہیں کہ کسی بھی Piece of art
سے بھی یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں کچھ لوگ میرؔ کو غالبؔ سے اچھا یا کچھ
اسکے برعکس سمجھ سکتے ہیں اپنا اپنا ذوق مطالعہ، مشاہدہ اور ذہنی تربیت
ہماری پسند ناپسند پر اثر انداز ہوتے ہیں اور لوگ ایک ہی چیز کو مختلف
حیثیتوں سے پسند ناپسند کرتے ہیں میں نے لکھا بھی ہے اور یہاں بھی وہ مثال
دئے دیتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک فرد کو سونے کا ہیرے جڑا ایک کنگن
ملتا ہے وہ اسے سونار کے پاس لیجاتا ہے سنار اسکے دام پانچ سو لگاتا ہے
پھر وہ کسی میوزیم کے ماہر کے پاس جاتا ہے اور وہ اسے مشورہ دیتا ہے کہ برٹش
میوزیم میں اس کے دو ہزار روپے مل سکتے ہیں کیوں کہ وہ مغلیہ عہد کا زیور
ہے پھر اسے مغلیہ عہد کے نقش و نگار پر تحقیق کرنے والا ملتا ہے وہ اس
کی قیمت چار ہزار روپے بتاتا ہے اور کوئی حق پرست کو اگر یہ معلوم ہو جائے
کہ یہ کنگن نور جہاں نے پہنا تھا تو وہ شاید اس کی اور بھی زیادہ قیمت
دے سکتا ہے۔ اس طرح ہر ایک اپنے مزاج کے مطابق اس کی قیمت مقرر
یہی بات ادب کے ساتھ بھی ہے ادب کی قدر و قیمت اس کی پوری
شکل اور خصوصیات کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ صرف ہیئت یا صرف موضوع

کی بناء پر قدر و قیمت طے کرنا درست نہیں اس لئے جس شاعر یا ادیب کو ان دونوں پہلوؤں کا خیال ہوگا وہی ادیب یا شاعر کامیاب ہوگا۔

آخر میں مجھے طالب علموں سے تقریر کا خلاصہ دو منٹ میں یہ کہنا ہے کہ ادب کا مطالعہ دوسری سائنسوں سے مختلف ضرور ہے مگر سائنس کے مطالعہ سے کم جان لیوا نہیں۔ ظاہر ہے کہ سائنس کا تجربہ مادی طور پر ممکن ہے مگر ادب کو پرکھنے کا پیمانہ ہمارا ذوق، علم عروض، روایت الفاظ اور ان کے استعمال وغیرہ کا علم ہے اور انھیں پیمانوں کے ذریعے ہم اسے پرکھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔"

سیفیہ کالج میں احتشام حسین نے "موجودہ ادب کے تقاضے" عنوان سے تقریر کی تھی جو نوائے سیفیہ جلد ۲ شمارہ ۲ دسمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کی شام کو ممنون حسن خاں کے دولت کدہ پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا جہاں احتشام حسین نے نئی شاعری پر تقریر فرمائی اور نئے شعراء کے یہاں روایت سے آزاد رہنے، روایت سے نفرت کرنے کے رویہ کی نشان دہی کی تھی۔

احتشام حسین اردو کے نامور ادیب اور محقق تھے۔ ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک وہ اردو کے تمام اساتذہ میں بہترین مقرر تھے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اور ہندوستان سے باہر انھوں نے بے شمار تقریریں کیں اور یہ تقریریں ان کی شخصیت، فکر اور علمی و ادبی سرمایہ کا پرتو تھیں۔ احتشام حسین کی کسی ایسی تقریر کا علم نہیں ہوا ہے جو انھوں نے پہلے سے تیار کی ہو اور کسی علمی یا ادبی محفل میں پڑھی ہو۔ بیشتر تقریروں کی رپورٹیں ان کی نظر سے نہیں گزریں اس لئے احتشام حسین کی تقریروں کے مطالعہ میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

(فروغ اردو لکھنؤ۔ اپریل ۱۹۷۵ء)